

نظریہ قرآن پر ایک نظر

ایک قرآن

مصنف

AU

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

ناشر

پیشکش اللہ خاں ریویں و ڈیلاہو

۲۹۲۵۱۶۲
ط ۱۹
لم لم لم لم

قیمت: دو روپے

DATA ENTERED

☆ کتبہ: مختار احمد دبیر۔

☆ طابع: انتشار پبلس لاہور۔

☆ ناشر: ایم ثناء اللہ خاں

۲۶ ریوسے روڈ لاہور

فہرست

- ۶۶ تہیید
- ۲۳ بجزئیات کا حسن و برقع کلیات کے تابع ہے
- ۵۶ مادی طاقتوں پر پھروسہ کرنے کی بنیادی علت
- ۸۳ قرآن کا مقصد و جہد تکمیل خلافت ہے
- ۸۲ معیار خلافت و استخلاف
- ۸۵ کمالات خداوندی کی نوعیں
- ۸۶ بعثت انبیاء کا مقصد انہی کمالات سے گانہ کی ترویج و تکمیل ہے
- ۹۰ کمالات سے گانہ کی نوعیت



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة
والسلام على سيدنا ومولينا محمد خاتم الأنبياء والمرسلين
وعلى آله أصحابه أجمعين. وَعَلَيْتُمْ مَهْمًا يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

اِنَّا بِكَ

حق جل شانہ نے اپنی قدرت سے اس علم کو خیر و شر سے مرکب پیدا
فرمایا نور اور ظلمت۔ سیاہی اور سفیدی حق اور باطل، پاک اور ناپاک
بھلا اور بُرا۔ عاقل اور غبی۔ جن اور انس۔ شیطان اور فرشتہ۔ امیر
اور فقیر، بادشاہ اور جاروب کش سب اسی نے پیدا کئے یہ سب حق تعالیٰ
کی کائنات اور مخلوقات ہیں۔

پھر حق جل شانہ نے حق اور باطل میں فرق کرنے کے لئے انبیاء کرام کو
صحف ہدایت دے کر دنیا میں بھیجا۔ جن میں خیر و شر کے اور حق اور باطل
کے متعلق احکام تھے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے اور یہ خیر ہے اور یہ
شر ہے حق کا اتباع کرو اور باطل سے پرہیز کرو۔ سب سے اخیر میں
قرآن کریم نازل ہوا جس میں حق و باطل اور خیر و شر کا فرق اور حلال و حرام
کی تفصیل کی گئی اور جا بجا کائنات ارضی و سماوی میں تدبیر و تفکر کا حکم دیا تاکہ
اس حق جل شانہ کی عظمت و جلال کی معرفت حاصل ہو جس نے ان تمام
کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اور پھر معرفت کے بعد اس کے احکام کی تعمیل
کیں۔

حکما اور فلاسفہ نے بھی کائنات ارضی و سماوی میں خوب غور و فکر کیا
مگر ان کا مقصد فقط کائنات ارضیہ اور سماویہ کو جاننا اور پہچانا تھا اور
حضرت انبیاء اور ان کے متبعین نے بھی کائنات میں غور و فکر کیا لیکن ان
کا مقصد کائنات کی معرفت نہ تھی بلکہ رب کائنات اور حق ارضی و
سموات کی معرفت اور پھر اس معرفت سے اس کی اطاعت مقصود تھی
تقریباً ہی میں بہان بھی داخل ہوتا ہے اور محل کی چیزوں کو دیکھتا ہے اس کا

کا مقصد بادشاہ کی شان و شکوہ کو دیکھنا ہوتا ہے اور چور بھی شاہی محل میں داخل ہوتا ہے اور ہمان سے کہیں زیادہ ہر چیز کو غور و فکر سے دیکھتا ہے

اس کا مطیع نظر محل کا ساز و سامان ہے وہ بادشاہ کو دیکھنا نہیں چاہتا، انبیاء ^{آفری} کرام اور فلاسفہ کی نظر میں بس یہی فرق ہے۔ کہ انبیاء کرام سموات و ارض میں اللہ کی قدرت اور عظمت کے پہچاننے کے لئے غور و فکر کرتے ہیں۔ اور فلاسفہ اور سائنس دانوں کو خدا سے کوئی واسطہ نہیں ان کا مطیع نظر فقط معذنیات کو جاتا ہے

پروفیسر غلام جیلانی برقی نے حال میں دو قرآن کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں مصنف نے یہ بتلایا ہے کہ ایک قرآن تو یہ ہے کہ جو شکل مصحف ہمارے سامنے ہے اور ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں یہ علمی قرآن ہے اور دوسرا قرآن یہ صحیفہ کائنات ہے جو عناصر اربعہ اور مواد ثلاثہ کی شکل میں ہمارے سامنے جلوے کر رہے یہ عملی قرآن ہے۔ نباتات اور معدنیات اور فلکیات میں غور و فکر کرنا اور ان کے منافع سے منتفع ہونا قرآن کا اصل موضوع اور اصل مقصد یہی ہے۔

برقی صاحب اس مجموعہ کائنات کو دوسرا قرآن بتاتے ہیں۔ اور یہ نہیں

سمجھتے کہ اہل کائنات میں خیر و شر، پاک اور ناپاک، گلاب اور پشاپ۔ گدھا اور کتا
 اور خنزیر سب ہی کچھ ہے۔ کیا ان کا دل ان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس
 پاک اور ناپاک کے مجسمہ پر قرآن کریم جیسا مقدس اور پاک لفظ اطلاق کیا جائے
 معاذ اللہ و استغفر اللہ قرآن تو حق جل شانہ کے کلمات کا نام ہے۔ صحیفہ کائنات
 میں خیر بھی ہے۔ اور شر بھی مگر صحیفہ آسمانی یعنی قرآن کریم میں سوائے خیر محض کے
 کچھ نہیں۔ قرآن کریم حق تعالیٰ کے احکام تشریحیہ کے مجموعہ کا نام ہے اور مجسمہ کائنات
 کا نام قرآن نہیں۔ برقی صاحب یورپ کی زرق و برق سے اس قدر مرعوب ہوئے
 کہ ان کو تشریح و تکوین کا فرق سمجھ میں نہ آیا۔ قرآن کریم نے احکام تشریحیہ کے اتباع
 کا حکم دیا ہے امور تکوینیہ کے اتباع کا حکم نہیں دیا۔ لہذا وہ شیاطین و نون بھی اسی کی مخلوق ہیں۔ مگر حکم
 یہی ہے کہ وحی ملنے کا اتباع کیا جائے وحی شیطانی کا اتباع نہ کیا جائے۔ اسی نے مروود اور شداد
اور فرعون اور ہامان اور تمام متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کو پیدا کیا جن کی مادی ترقیات
 کے آثار آج کل کے فرعون و ہامان کھود کھود کر نکال رہے ہیں۔ اور لوگوں کو دکھلا
 رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہی وہ متمدن قومیں ہیں کہ جو انبیاء کرام کے مقابلہ کی
 وجہ سے ہلاک اور برباد ہوئیں۔ یہ نشانات و حقیقت انکے ترقی کے نہیں بلکہ
 اس ہلاکت اور بربادی کے نشانات ہیں۔ جو حضرات انبیاء کے مقابلہ کی وجہ سے

ان پر آئی۔ برقی صاحب کی نگاہ اس زمانہ کے نارودہ اور فراعنہ کے ذریعہ
 برقی اور مادی ترقیات دیکھ کر اس قدر چکاچوند ہوئی کہ ابراہیم خلیل اللہ اور
 موسیٰ کلیم اللہ کی ظاہری بے سرو سامانی ان کو حقیر معلوم ہونے لگی اور اس
 زمانہ کے نارودہ اور فرعون ان کو بلند مرتبہ نظر آنے لگے مگر ان کو
 یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ کی یہ سنت یہی ہے کہ متقدمین اور ترقی یافتہ
 ... قوم کے مقابلہ اور ان کا تختہ الٹنے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں
 کو بھیجتا رہا۔ کہ جن کے پاس یٹنے کے لئے سوائے یورپ کے اور
 اور ٹھننے کے لئے سوائے گڈی اور کمبل کے اور کھانے کے لئے
سوائے سوکھے نغمے کے کچھ نہ تھا فرعون اور ہامان اور تمام قبطی قوم
 جنگلوں اور باغوں اور چشموں اور نہروں میں عیش کرتی تھی۔ اور خدا
 کا برگزیدہ بندہ کلیم اللہ۔ اپنی گلیم (کمبل اور گڈی) لئے ہوئے خوف

سے چھپا پھرتا تھا۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام

اسی طرح کچھ مدت تک متابلہ رہا بالآخر حضرات انبیاء کرام باوجود
 بے سرو سامانی کے غالب اور کامیاب ہوئے اور ان کے دشمن
 تباہ اور برباد ہوئے کوئی عرق کیا گیا کوئی زمین میں دھنسا یا گیا۔ کسی پر آسمان

سے پتھر برساتے گئے، کسی کو بندر اور سور بنایا گیا۔
 اِنَّ كُلَّ اِلَّا كَذَّبَ الرَّسُولَ فَمَثَقَابِ

جملہ قرآن ست در قطع بدب

عز و ریش و ہلاک بولہب

اخیر میں حق جل شانہ نے نبی صر مصل اور رسول صد شتر
 کبلی والے نبی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا کہ
 جس کے بدن پر ایک کبل اور گھر میں ایک پوریا تھا اور دو دوہینہ
 تک جس کے گھر میں تو نہ چڑھتا تھا۔ جلانے کے لئے گھر میں
 چراغ نہ تھا۔ مگر باوجود اس بے سرو سامانی آپ کے
 غلاموں کے ہاتھ سے قیصر و کسری کا تختہ الٹا دیا۔ اور روئے
 زمین کے خزانوں کا ان کو مالک بنا دیا

خلاصہ کلام یہ کہ:-

انبیاء کرام کی بشت کا مقصد ہی روحانیت سے ماویت کو شکست دینا
 ہے جس کا دینا ہزاروں بار مشاہدہ کر چکی ہے اب جس کا جی چاہے
 حضرات انبیاء کرام کا دامن پکڑے اور جس کا جی چاہے عادی محمد اور

فرعون اور فرود کے طرح ترقی یافتہ اقوام کا کاسہ لیس بنے
 مَنْ جَرَّبَ الْمَجْدِبَ حَلَّتْ بِهِ الْمُدَامَةُ

برق صاحب کے اس مضمون یعنی (دو قرآن) کا حضرت مولانا حامی محمد طیب صاحب ہتھم دار علوم دیوبند دامت برکاتہم نے جو اب تحریر فرمایا۔ جس کا عنوان (نظریہ دو قرآن پر ایک نظر) ہے جو روحانیت اور مادیت کے فرق اور دنیاوی ترقیات اور تمدن کی بے ثباتی اور حضرت انبیاء کی فراغ اور نمار وہ کے مقابلہ میں خارق عادت کامیابی اور کامرانی کے بیان میں بے مثال اور بے نظیر تحریر ہے۔ - ع -

(حرف حقیقی می دہد جان را رواق)

اس تحریر کے پڑھنے سے حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اور آخرت کا منظر اور دنیاوی ترقیات کا بے حقیقت ہونا نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت یورپ کی مادی ترقیات کی حقیقت وہی ہے کہ جو قوم عاد اور ثمود اور فرعون اور فرود کی ترقیات کی حقیقت تھی۔ انبیاء کرام کے سامنے سب سب تھے۔ قاری محمد طیب صاحب کی اس پاکیزہ اور دلپذیر تحریر کو دیکھ کر بار ہا دل میں

یہ خیال آیا (اور خدا کرے صحیح ہو) کہ چونکہ یہ نثر یہ مولف کے قلم سے ذرا عینہ اور نماروہ کے رد میں۔ اور حضرات انبیاء کرام کی نصرت اور حمایت میں ایک خاص جذبہ ایمانی سے نکلی ہے۔ اس لئے عجیب نہیں کہ بوقت تحریر حضرات انبیاء کرام کی ارواح طیبہ اور نفوس قدسیہ کی باطنی اور روحانی توجہات اس پاکیزہ مولف کی طرف متوجہ ہوں اور اللہ صمد ابدہ برح القدر کی تائید غیبی سے مولف کا قلم چل رہا ہو۔

حق تعالیٰ شانہ مولف محترم کو اور ہم غلامان انبیاء کو حضرات انبیاء کرام کی معیت اور مرافقت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین
اس تحریر دل پذیر کے ظاہری اور معنوی حسن و جمال کو دیکھ کر بے اختیار چند اشعار زبان پر آگئے۔

شاد باش اے خستہ بیمار نظر	کز برایت می رسد کحل البصر
ابن حقائق این معارف را بین	ابن چنین ببیند نگاہ دور ہیں
پختہ از کلک آن روشن ضمیر	کہ ندارد در حقائق او نظیر
طیب بن قائم است آن ارجمند	نظم دار العلوم دیوبند
ہست قرآن یک و لیکن احوال	از حول بیند آن را و قرآن

پہنکاپن ۱۲

ہم جنہیں اسلام ایک اے خوش سیر ایک دو اسلام گوید بد نظر

احولی چوں رفعت بجیاں شوند آں دوسہ گویاں یکے گویاں شوند
یہ آخری شعر عارف رومی قدس سرہ السامی کا ہے اور اول کے چھ شعر
اس خفیہ سر اپنا تقصیر کی طرف سے ہیں۔

اب اس مختصر تحریر کو ختم کرتا ہوں اور اہل اسلام سے استدعا کرتا ہوں
کہ اس تحریر کو اول سے آخر تک بار بار پڑھیں انشاء اللہ تعالیٰ باعث
ہدایت اور موجب صد بصیرت ہوگی۔ حق تعالیٰ نشاۃ اس تحریر دل پذیر کو قبول
فرمائیں اور لوگوں کے لئے موجب ہدایت و رشد بنائیں۔ آمین تم آمین اور ہم سب کو
دین حق پر استقامت نصیب فرمائیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ خدام
میں ناکاروں کا حشر فرمائیں۔ آمین یا مَرَاتِ الْعَلَمِیْنَ صَلَّى اللهُ
تَعَالَى عَلَیْ خَیْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَىٰ آلِهِ وَآحِبِّهِ
اَجْمَعِیْنَ ۝ وَعَلَيْنَا مَعَهُمْ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۝

از محمد ادریس کاندھلوی کان اللہ وکان ہو اللہ وکیل ہمتہ و ہواہ فیما یحبہ ویرغناہ آمین

۳ صفر اخیر لوم الخمیس ۱۳۷۲ھ جامعہ شریفہ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید

الحمد لله وكفى وسلاماً على عباده الذين اصطفى۔

امّا بعد۔ محترم پروفیسر غلام جیلانی صاحب برق کا مضمون ”دو قرآن“ ماہ
 محرم ۱۳۷۰ھ میں نظر سے گزرا جبکہ میں کراچی میں مقیم تھا یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں ان کے
 قلم سے نکل کر رسالہ ”البيان“ میں قسط وار شائع ہوا۔ اور آج ۲۲ ص ۲۳ صفحہ کی ایک مستقل کتاب
 کی صورت میں اصحاب نظر کے سامنے ہے مصنف نے ”دو قرآن“ کے عنوان
 سے اس قرآن مجید کو جو اوراق میں مرقوم شدہ ہمارے سامنے ہے ”علمی قرآن“
 کہا ہے جو ایک ضابطہ حیات ہے۔ اور اس پوری کائنات کے محسوس صحیفہ کو جو اپنی
 عظمت شکل میں عناصر اربعہ اور مواد ثلاثہ کو دامن میں لٹے ہوئے ہماری
 آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہے ”علمی قرآن“ کہا ہے۔ یعنی ایک قرآن خدا کا
 قول ہے اور ایک قرآن اس کا فعل ہے، مولف نے ان دونوں قرآنوں
 کی کتبوں کو جس میں سے کتاب کی آیتیں تشریحی ہیں اور کائنات کی تکوینی ایک
 دوسرے پر منطبق کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ جس طرح اس علمی قرآن کا مطالعہ فرض

ہے اسی طرح اس صحیفہ کائنات یعنی عملی قرآن کا مطالعہ بھی فرض ہے بلکہ پہلے مطالعہ سے کبھی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ

”مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا

جاسکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم و زکوٰۃ - حج طلاق قرض وغیرہ

پر ڈیڑھ سو آیات ہیں اور مطالعہ کائنات کی سات سو چھپن (دو قرآن ص ۱۱)

احمالانکہ انہیں پتہ نہیں کہ صرف ایک نماز ہی کی تاکید سات سو آیتوں

میں فرمائی گئی ہے (

پھر ان مقدمات سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے کہ نزول قرآن کا اہم مقصد ہی کائنات

فطرۃ کا مطالعہ ہے دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان مادی اور تکوینی امور سے انتفاع

اور استفادہ کرنا ہی قرآن کا اصل موضوع اور حقیقی منشا و خداوندی ہے

جس کو ترقی کہنا چاہیے بلکہ یہ استفادہ و انتفاع ہی وہ حقیقی دین ہے جس کو

لے کر قرآن نازل ہوا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

”اگر آج یہ کتاب (قرآن) ہمیں معاویہ و فائز جبال اور خداوند

بھار سے مستفید ہونے کا درس نہیں دیتی اور ترقی یافتہ اقوام کا ہمدوش نہیں

بناتی تو یہ کتاب (حاکم بدین) صراحتہ ناقص و ناکمل ہے اور اس کا دعویٰ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (میں نے آج تمہارا دین کامل کر دیا)

(نعمو فی اللہ) بے بنیاد ہے“ (دو قرآن ص ۱۱)

پھر اس کائنات سے استفادہ کی صورت (جو بزعم برقی صاحب مشا خداوندی اور مقصد نزول قرآن ہے) وہ بتائی گئی ہے جو کہ آج کی مادہ پرست مغربی اقوام نے پیش کی ہے یعنی ماویات کی ترکیب و تحلیل اور تجزیہ و تالیف کے ذریعہ ایجادات اور تمدنی ترقیات وغیرہ۔ نہ وہ کہ جس کا نمونہ علمائے اسلام پیش کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا

” آج اہل مغرب سوئے، تانے، بارود، اور دیگر خزان ارضی سے فائدہ اٹھا کر فلکِ علم و ہنر پر آفتاب بنے ہوئے ہیں۔ ہواؤں میں اڑ رہے، اور دریاؤں میں تیر رہے ہیں۔ زمین کے بعید ترین اطراف کی خبریں لمحوں میں سن رہے ہیں۔ عملِ تجزیہ سے ریلیں دوڑا رہے ہیں۔ آنے والے حوادث سماویہ (باد و باران) کی خبریں سن رہے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ صحیفہ کائنات کے مطالعہ کرنے کے بعد اس کے قوانین و آیات کو اپنی بہتری کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ہمارا مذہبی رہنما یعنی مولا اعمالِ خدا سے اس قدر جاہل، منشا راہی سے اس قدر کور اور مطالعہ کائنات سے اس قدر بیگانہ ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہوا میں چراغ کیوں بجھ جاتا ہے؟ اور آگ کیوں بھڑک اٹھتی ہے؟ دل کیوں دھڑک رہا ہے؟ سانس کی آمد و رفت کیوں ہے؟ دست و پا دل و دماغ جو اس اعصاب

اور عروق و عضلات میں اللہ کے کون کون سے معجزات موجود ہیں۔
 رحم مادر میں بچے کی تخلیق کس طرح ہوتی ہے؟ مرور زمانہ کا کربہ ارض
 پر عمل کیا اور کیوں ہے؟ الغرض مَلَائِکَہِ السَّلَامِ اعمال الہی سے بیکسر
 غافل، معجزات تخلیق سے قطعاً نا آشنا۔ فطرت کے ایمان افروز کارناموں
 سے بالکل بیگانہ ہے اور پھر بھی علم کا مدعی ہے۔ (دو قرآن ص ۱۲)
 پھر کہا گیا کہ خلافت الہی کے معنی بھی اسی مادی ترقی کے ہیں جس کے لئے خدا
 نے انسان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنا کر اتارا ہے۔ اور یہی اطاعت خدا
 وندی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

”زمین پر انسان اللہ کا قائم مقام ہے۔ جس طرح اللہ مادہ کو توڑ پھوڑ
 کر تخلیق کے نئے نئے مناظر دکھاتا ہے۔ اسی طرح انسان کو بھی اللہ کی
 پیروی کرنا چاہیے۔ اور لوہے، تانبے اور دوسرے معادن سے
 موٹریں، جہاز اور دیگر قوت کے سامان تیار کرنا چاہئیں۔ اَطِيعُوا اللَّهَ
 (تم اللہ کی اطاعت کرو)“ (دو قرآن ص ۱۲)

پھر دو قرآن ص ۱۵ پر کہا گیا کہ ایمان داری و حقیقت یہی دنیا داری ہے یعنی
 دنیوی اور مادی ترقی ہی وہ کَلْبُودِ عِظَمَتِہِ ہے جس کو قرآن نے
 اَنْتُمْ اَلْاَعْلَوْنَ کے عنوان سے ظاہر فرمایا ہے۔ اس لئے حقیقتاً مومن
 تو ہیں مگر ان مغرب کی اقوام ہیں جو اس مادی جوڑ توڑ میں اس وقت سب سے

آگے ہیں اور کافر و منکر قومیں درحقیقت اس وقت کی وہ مسلم اقوام ہیں جو ان مادی وسائل اور ان کی ترقیات میں فی زمانہ پسماندہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال تالیف زیر نظر کے وعاری اور مقاصد کا خلاصہ یہ ہے کہ منشاء خداوندی - مقصد نزول قرآن - معنی ایمان - مطلب خلافت اور حقیقی علوم و عظمت یہی مادی وسائل کی ترقیات اور یہی کمرہ ارض کے مختلف خطوں کی حکمرانی ہے اور انہیں تکوینیاتی امور کے تکمیل کنندے فی الحقیقت خلفاء الہی قرآن کے مطیع اور اللہ کے مومن و ذانت بندے ہیں۔ ورنہ جو لوگ بھی اس سائنٹیفک ترقیات و ایجادات سے نابلد ہیں وہ علم قرآن سے نابلد فہم قرآن سے عاری اور منشاء الہی سے جاہل ہیں۔

تمہید کی اس اصولی بحث کے بعد مصنف نے اسی اصول کی روشنی میں آئندہ پوری کتاب میں جزئیات کا ذخیرہ پیش کرتے ہوئے مختلف آیات قرآنی سے اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کا یہی استعمالی مطالعہ اور اس کے مواد و عناصر میں ہی ایجادی تصرفات اس کے کھلے اور چھپے خزانوں کی یہی تسخیر اور ان سے نفع اٹھانے اٹھانے زندگی تیر کر دینا ہی تخلیق انسانی کا مقصد اور قرآن حکیم کا حقیقی منشا ہے۔ جہاں تک سائنس کے اصول کے مطابق قرآنی آیات کو کائناتی آیات پر ڈھالنے اور تکوینی عجائبات کو قرآن کا موضوع دکھلا کر تشریح کی اس معجز کتاب سے ان کے

استخراج کرنے کا تعلق ہے برق صاحب کی یہ کاوش اور خدمت کوئی نہیں اور اچھوتی خدمت نہیں ان سے پہلے علامہ مشرقی (خاکسار لیدر) اپنی کتاب "تذکرہ" میں اور ان سے پہلے علامہ طنطاوی مصری اپنی تفسیر جو اہل القرآن میں اس خدمت کو انجام دے چکے ہیں اور اصحاب نظر اس کا کھرا اور کھوٹا بھی واضح کر چکے ہیں اس لئے برق صاحب کی یہ تالیف زیر نظر ایک مصری اور ایک ہندی کا نقش قدم ہے جسے نقش ثالث کے طور پر انہوں نے پیش کیا ہے۔ تاہم ایک علمی کاوش کی حیثیت سے ان کی یہ محنت بایں معنی قابل لحاظ بھی ہے کہ اس سے علمی سلسلے کے کچھ نئے پہلو ایسے ضرور پیدا ہو گئے جن پر ناقدانہ غور و فکر کرنے سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی گوشوں کے کھل جانے کا موقع نکل آیا ہے۔ گو خود برق صاحب کے یہ پیش کردہ پہلو منشاء قرآنی اور قواعد شرعیہ کے سترائے خلاف بھی ہیں کیونکہ جس نظریہ اور نصب العین کی روشنی میں یہ جزئیاتی پہلو سامنے لائے گئے ہیں وہ نظریہ خود قرآنی منشا اور موضوع قرآنی کے خلاف جا رہا ہے۔ اس لئے یہ جزئیاتی کاوش بھی قرآنی نقطہ نظر سے مستحسن نہیں ٹھہر سکتی۔

۲۲

جزئیات کا حسن و قبح کلیات کے تابع ہے

وجہ یہ ہے کہ جزئیات یا فرعیات کسی بھی دائرہ کی ہوں اور کتنی ہی صحیح بھی کیوں نہ ہوں خود بذاتہ ان کا حسن و قبح کوئی معیاری یا مقصد بہ چیز نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی خوبی و خرابی کا معیار درحقیقت ان کا کلیہ یا اصول ہوتا ہے جس کے سلسلہ سے وہ پیش کی جاتی ہیں۔

مثلاً اگر ایک شخص نماز کے شرعی فضائل بیان کرے مگر خود نماز کو ذکر اللہ اور قرب الہی کے بجائے پہلوانی کے نقطہ نظر سے دیکھ کر ایک جسمانی ورزش کہے تو گو یہ فضائل خود اپنی جگہ کتنے ہی صحیح ہوں مگر اس خاص نقطہ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے۔ کیونکہ وہ اس نقطہ نگاہ کے فضائل ہی نہیں۔ اس لئے بات صحیح ہونے کے باوجود اصولاً کذب محض اور خلاف واقعہ ہو جائے گی۔

یا اگر ایک شخص حج کے شرعی محاسن پر تقریر کرے مگر خود حج کو سیاسی نقطہ نظر سے محض ایک بین الاقوامی کانفرنس تصور کرنا ہو جو تباہ کن افکار یا مظاہرہ اجتماعیت

کے لئے معتقد کی گئی ہو نہ کہ مظاہرہ عشق و محبت خداوندی کے لئے تو یہ سارے فضائل اس نقطہ نظر سے غلط ٹھہر جائیں گے اگرچہ خود یہ فضائل صحیح اور منصوص بھی ہوں۔ کیونکہ سلسلہ نظر بدل جانے سے وہ بے محل استعمال ہوتے اور کذب محض ہو گئے۔

یا اگر ایک شخص قربانی جیسی عبادت کے مناقب تو شرعی بیان کرے مگر خود قربانی کو خدیہ نفس یا بدل جان سمجھنے کے بجائے معاشی نقطہ نظر سے محض غریبوں کی خبر گیری کا ایک اقتصادی پہلو باور کرتے ہوئے اس کی غرض و غایت صرف اغانت فقر اور مساکین تبار کے اور اس لئے خون بہانے کے بجائے پیسے خرچ دینے کو کافی بلکہ ضروری کہے تو فضائل قربانی پر اس کا یہ سارا بیان غلط ٹھہر جائے گا کہ نقطہ نظر کے بدل جانے سے یہ فضائل قربانی کے فضائل ہی نہ رہے۔

یا اگر ایک شخص علم کی ضرورت و فضیلت پر قرآنی آیات سے مدلل اور معقول تقریر کرے مگر عمرانی نقطہ نظر سے یہ علم اس کی نگاہ میں فلسفہ و سائنس یا ہندسہ و ریاضی ہو تو یہ ساری تقریر اس لئے غلط ہو جائے گی کہ منصوص فضائل کی یہ تقریر اس نے خود اپنے زاویہ نگاہ سے کی نہ کہ قرآنی نقطہ نظر سے۔ گو فضائل کی آیات و روایات اپنی جگہ بالکل حق اور درست ہیں۔

بہر حال نقطہ نظر کی تبدیلی سے چیز بیانی مسائل کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جبکہ چیز ہی مسائل کی صحت و سقم اور حسن و قبح کا معیار ان کا وہی کلیہ اور اصولی

نقطہ نگاہ ہوتا ہے جس کے سلسلہ سے یہ چیزیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ یہ علمی اور نظری فرق ایسا ہے جیسا کہ عمل کے دائرہ میں شرعی حسنات خیرات ثابت بابے محل استعمال ہونے سے سیات بن جاتی ہیں۔ غیبت میں سچ ہی بولا جانا ہے غلط گوئی نہیں کی جاتی، پس لپشت عیب بیانی چونکہ موجب فتنہ و فساد و ذات البین اور بے محل ہوتی ہے اس لئے یہ سچ قبیح بن جاتا ہے اور اس سے وہ جھوٹ ہزار درجہ بہتر ثابت ہوتا ہے جو مصلحت ذات البین کے لئے بول دیا جائے پس سچ فی نفسہ حسن ہے مگر سلسلہ استعمال قبیح ہو جانے سے وہ بھی قبیح ہو جاتا ہے پس فضائل ہوں یا احکام اپنے حسن و قبح میں اپنے کلیات و نظریات کے حسن و قبح کے تابع ہوں گے کسی سلسلہ میں اگر خود ان کا ذاتی حسن و قبح معتبر نہ ہو گا کہ صرف اسے ہی اثبات مدعا کی کافی دلیل سمجھ لیا جائے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ چیزیات جمع کر کے نقطہ نظر بنانا یا کلیہ اور اصول قائم کرنا فہم اور ذوق کے تابع ہے اس لئے نظریہ کی خوبی و خرابی درحقیقت ذوق و وجدان کے صحت و سقم کے تابع ہے۔ اگر مذاق ہی سلیم یا شرعی نہ ہو اور وہ ذہنیت ہی مستقیم نہ ہو جس سے نظریات ابھرتے ہیں بلکہ شرعی حیثیت سے زیغ اور کجی لئے ہوتے ہو تو ظاہر ہے کہ نظریات اور استنباط کردہ اصول بھی اسی زیغ اور کجی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اور اس لئے اس

سے پیدا شدہ یا حکم کردہ تمام جزئیات و ذریعات اس ایک ہی جامع فصلہ
 سے غلط ٹھہرائیں گی کہ ان کا کلیہ اور نظریہ اور نظریات میں سمایا ہوا ذوق غلط
 اور ٹیڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس نقطہ نظر بنانے والی قوت یعنی
 ذوق اور ذہنیت کی اصلاح و تقویم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اسی
 اصلاحی عمل کا نام تزکیہ رکھ کر اسے نبوت کے فرائض چارگانہ میں سے ایک
 اساسی اور بنیادی فریضہ قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے
 بنا رکبہ کے وقت اپنی ذرئیہ کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے ایک عظیم الشان
 رسول مبعوث کئے جانے کی دعا مانگتے ہوئے یہی چار باتیں تلاوت آیات،
تعلیم کتاب، تلقین حکمت، اور تزکیہ نفوس بطور فرائض رسالت اللہ سے مانگی
 تھیں جن میں سے آخری بات جو اول کی تین باتوں کے لئے اساس و بنیاد ہے
 یہی تزکیہ، ظاہر فرمایا تھا کہ اس کے بغیر دل کا وہ ذوق ہی درست نہیں ہو سکتا
 جو نقطہ نظر اور نظریات کے صحیح ہونے کا معیار ہے۔ پس اس تزکیہ کا حاصل
اصلاح قلب اور اصلاح قلب کے واسطے سے اصلاح اخلاق اور اصلاح
اخلاق کے واسطے سے اصلاح ذوق و ذہنیت سے تاکہ ذہن انسانی
 درست ہو کر فہم سلیم، ذوق صحیح اور دل و دماغ کا نقطہ نگاہ بیدھا ہو جائے
 اور انسان ہر مسئلہ کو اسی کے رنگ میں دیکھنے کا اہل ہو جائے نہ کہ اپنے
 نفسانی رنگ میں پرکھنے کا جو اس پر ماحول یا عوارض وغیرہ کے سبب چڑھا ہوا

ہو۔ پس نہ تو مفکر کا نقطہ نگاہ پھرا ہوا ہو کہ دیکھ ہی نہ سکے نہ بھیندگا ہو کہ ایک کے

دو دیکھنے لگے۔ اور نہ ناقص ہو کہ دو کو ایک دیکھنے کا خوگ ہو جائے۔ بلکہ جو کچھ ہو جتنا

ہو اور جیسا ہو وہی بعینہ دیکھے اللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ حاصل یہ کہ

محض اس کا ارادہ اور نیت ہی مسلمان نہ ہو بلکہ وجدان بھی مسلمان بن جائے کہ

جو کچھ بھی وہ کتاب و سنت سے سمجھے اور دیکھے صرف مسلمانہ ذوق سے سمجھے اور

دیکھے نہ کہ منکرانہ اور ملحدانہ ذہنیت سے۔ ورنہ انہی قرآنی آیات کو مثلاً مشرکانہ

ذوق و ذہنیت سے سمجھا جانے لگے تو ان کا رنگ اور ہوگا۔ نصرانی ذوق سے

دیکھا جائے تو رنگ دوسرا ہوگا۔ یہودی رنگ سے پرکھا جائے تو رنگ گرو

ہوگا۔ آیات قرآنی ہر صورت میں وہی رہیں گی مگر ان کے مضامین اور مقاصد

کی نوعیت کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ اور ہر رنگ میں عوام کو آیات قرآنی کا نام

لے کر متلائے فریب رکھا جاسکے گا۔

پھر اسی طرح مسلم جماعتوں کے مکاتیب خیال اور نقاط نظر جدا ہیں جو

اسی ذوق و وجدان کے تفاوت سے متفاوت اور بدلے ہوئے ہیں۔ مغزولہ

کا رنگ فہم اور ہے اور قدریہ کا اور۔ خواج کا ذوق و فہم اور ہے۔ اور

روافض کا اور۔ اس لئے بہ مقدار زیلع و استقامتہ اہل ان کے ذوق و وجدان

کا صحت و سقم بھی متفاوت ہے۔ ان وجدانوں سے نکلے ہوئے افکار و نظریات

عہ اے اللہ تمام اشیاء ہم کو اپنی اصلی صورت میں دکھا ۱۲

بھی متفاوت ہیں۔ اور ان نظریات کے ماتحت آیات و روایات کے اخذ کردہ
 معانی و مطالب بھی متفاوت ہیں جن میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق و
 تفاوت ہے۔ مگر قرآن کا نام ہر جگہ یکساں ہے اور اسی کی امامت کے نام پر
 لوگوں کو ان نظریات و حکمیات کی طرف بلایا جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ ان میں
 سے جس کے نظریات کو بھی غلط کہا جائے گا۔ اور جو بھی کہے گا وہ آیات قرآنیہ
 کی تغلیط نہیں کرے گا بلکہ اس طبقہ اور فرقہ کے مفہوم پر حکم لگائے گا اور یہی حکم
 انجام کار اس طبقہ کے ذوق اور وجدان پر ہوگا نہ کہ آیات پر۔ پس اس کے ذوق
 کے غلط ہونے کی وجہ سے نظریات کو غلط اور ان نظریات سے استخراج کردہ
 مسائل کو غلط کہا جائے گا نہ کہ آیات و روایات کو۔ اس لئے کسی کے پیش کردہ
 نظریات پر غور و فکر کرنے کے سلسلہ میں اس کے ذوق و وجدان اور
 ذہنیت سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ذوق و وجدان کی تربیت کا طریقہ سوائے ارباب ذوق و
 وجدان کی معیت اور کثرت ملازمت کے دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے لئے
 اسناد خلف اور شہادتہ سلف ہی سب سے بڑی حجت اور علامت سمجھی
 گئی ہے۔ اسی لئے ہر عالم کے علم پر حکم لگانے کے لئے اس کا سلسلہ سند
 اور اس کے اساتذہ کے دین و علم کی نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ
 سند ہی اس عالم کے علم کی صحت و سقم کی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔

صحابہؓ کے صحت ذوق کا ضامن صحبت نبوی اور ذات بابرکات سے انصباع اور آپ کے ساتھ استناد ہے جس نے مشترکانہ ذوق نکال کر ان میں موجدانہ ذوق و معرفت کو پیدا کیا۔ ان کے قلوب کا راستہ سیدھا کیا جس سے ان کا نقطہ نگاہ ہر کجی اور زلیخ سے پاک ہو کر خالص استقامت کی راہ پر آ گیا۔ اور وہ بہر مسئلہ قرآنی و حدیثی کو باقول داخلہ اسی کے رنگ میں سمجھنے کے اہل اور عادی ہو گئے۔

تابعین کے لئے صحابہ سے استناد و انصباع اور ان کی صحبت و معیت منشاء تربیت ذوق ثابت ہوئی۔ تبع تابعین کیلئے تابعین سے استناد و ملازمت اور صحبت یا فتگی اساس استقامت ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی طرح بعد کے قرون میں آج کے دور تک استقامت ذوق کے لئے یہی اہل ذوق و وجدان کی سند، معیت، ملازمت اور صحبت یا فتگی ہی سلامت ذہن و ذوق کی بنیاد ثابت ہوتی رہی ہے۔ جس سے رنگ پکڑنا اور منبصغ ہو جانا ہی صحت ذوق کا ضامن رہا ہے۔ جیسا کہ اس کے بالقابل اربابِ فتنہ میں اس سند و شہادت سے گریزا اہل اللہ کے اقوال و مذاق کی پیروی سے پہلو تھی۔ اہل دل کی معیت و ملازمت سے انقطاع۔ اہل حال کے احوال صادقہ سے رنگ نہ پکڑتا۔ اپنے ذاتی فہم و عقل پر غور و گہمند کرتے ہوئے سابقین کے فہم کو اپنے فہم کے لئے کسوٹی نہ سمجھایا یا الفاظ دیگر ان کے فہم سے اپنا فہم نہ بنانا ہی اساس فہم سمجھا گیا ہے اور فہم کی جگہ غور فہم پر قناعت کر لی گئی ہے۔ اس لئے مسائل فہمی میں ان کا ذہن و

ذوق امام رہا کیا ہے جو تربیت سے عاری رنگ انقیاد سے خالی اور صبیحتہ اللہ سے کورارتہنا آیا ہے۔ اور جس میں روحانی معرفت کے بجائے جبلی اور نفسیاتی خیالات گرد و پیش کے حالات اور وقت و وقت کے محرکات سے ذہنی مرغوبیت کے جذبات بھرے ہوئے رہ جاتے ہیں جو اس نا تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار اور نفس کے اختراعات ہوتے ہیں مگر غور و فہم سے ان کو مدلولات قرآن و حدیث سمجھ لیا جاتا ہے تا آنکہ انہی ناہموار جذبات سے نظریات اور نقاط نظر اُبھرنے لگتے ہیں جن سے جزئیات فہمی کا سلسلہ چل پڑتا ہے اس لئے وہ جزئیات خواہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں مگر ان غلط رو جذبات و افکار کے سلسلہ کے سامنے آکر اس لئے قابل قبول نہیں رہتیں کہ ان کے وہ مختصر اصول قابل رد ہوتے ہیں جو ذلیخ آمیز فہم و ذوق سے اخذ کئے جاتے ہیں پس بحث و نظر اور نقد و تبصرہ کے وقت اصل میں یہ بد ذوق نظریات رد کئے جاتے ہیں نہ کہ قرآنی جزئیات کو نظر ہر رد و قبول کا عمل ان پر بھی جاری نظر آتا ہے اس لئے استدلال میں قابل توجہ وہ جزئیات نہ ہوں گی جو پیش کی گئی ہوں بلکہ وہ اصول و نظریہ اور اس سے آگے وہ ذوق ہوگا جس کے سلسلہ سے یہ جزئیات سامنے لائی گئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید رکھی حالانکہ وہ نفس توحید کے منکر تھے نبوت پیش کی حالانکہ وہ نبوت کو بھی مانتے تھے مبادا و معاد پیش کیا حالانکہ وہ اس کے

بھی قائل تھے مگر پھر بھی انہیں منکر و کافر کہا گیا اور ان ہی عقائد کی دعوت دی گئی جن کے وہ کلیتہً منکر نہ تھے محض اس لئے کہ وہ ان مسائل کو مشرکانہ نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کے خوگر تھے اور حضور انہیں مؤمنانہ اور مسلمانہ ذہنیت سے سمجھانا چاہتے تھے۔ بالفاظ دیگر انہیں صرف مسائل ہی سمجھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کی ذہنیت اور ذوق و وجدان کو بھی تبدیل فرمانا چاہتے تھے جس سے خالق کا صحیح ^{بہتر} مفہوم ^{بہتر} ان کے ذہنوں میں اترا کرے اور محض ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان ہی مسلم نہ ہوں بلکہ ان کا دل و دماغ اور ذہن و وجدان بھی مسلم ہو جائے مگر جب کہ انہوں نے اس سلسلہ ہی کو قبول نہ کیا جس کی یہ جزئیات تھیں اور اس ذوق ہی کو نہ اپنایا جس سے یہ سلسلہ چلنا تھا تو وہ مسلم بھی نہ کہلائے گو فی الجملہ وہ ان تمام مسائل کے قائل تھے۔

مجھے معاف کیا جائے اگر میں یہ عرض کر دوں کہ برقی صاحب نے اس علمی قرآن اور کائناتی قرآن کی باہمی تطبیق دکھانے ہوئے جن مسائل کی طرف رہنمائی کی ہے ان میں کل یا بعض خواہ فی نفسہ صحیح بھی ہوں مگر اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ ان مسائل کو جس سلسلہ سے پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جس نقطہ نظر کا ثبوت دیا گیا ہے اور اس نقطہ نظر میں جس ذوق و ذہن سے کام لے کر ان مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ ذہن بظاہر تازہ بیت یافتہ اور خود اپنے ہی اختراعات کے دھوکہ میں آیا ہوا ہے کیونکہ انہوں نے قرآن کو اس کی حقیقی تشریحات سے الگ

کر کے محض زور مطالعہ اور محض اپنے ہی ذہنی رخ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔
 بلحاظ نقطہ نظر انہوں نے قرآن کو تقویٰ و طہارت، اخلاق و روحانیت، زہد و
 عبادت، خشوع و انابت، اتباع سنت و اقتضائے آثار سلف اور خلافت
 الہی کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عصری بنیادوں فلسفہ و سائنس،
 معاشیات و اقتصادیات، عمرانیات و سیاسیات، تفریح و تفریح اور سماجی
 و اقتدار یعنی ملوکیت و سلطنت، موجودہ دنیا کے خالص مادی افکار و نظریات
 کے نقطہ نگاہ سے دیکھا تو انہیں ہر آیت میں سے خالص مادیت کا ایک
 سیلاب منڈتا ہوا نظر آیا۔ اور آج کی تمدن اور برعکس نام نہاد و ہندسہ افراط
 کی عنصریاتی ترقی ہی ان کی مرعوب نگاہ میں قرآنی ترقی اور اس کا نصب العین
 دکھائی دینے لگی۔ حتیٰ کہ یہ مادی کھود کر پیدا اور اس کے مواید و خان و سجاد
 گیس و برق، ریل و تار، طیارہ و سیارہ اور فون و لاسلکی وغیرہ پھر ان وسائل
 نقل و حمل اور اسباب علم و خیر کے وسیلہ سے ایک طرف اسباب زینت و
 تفریح کی توسیع سے دنیا میں ہولناکی، عیاشی، حرص و آرزو، بد اخلاقی و سیاہ کاری
 اور صد انواع فسق و فجور کی وسعت و کثرت اور دوسری طرف اسباب
 تباہی و ہلاکت اور مہلک آلات حرب و ضرب گن اور بم اٹم اور گیس بارود
 اور نیزاب وغیرہ کی تیاری سے استبدادی طور پر اقوام عالم پر زور آزمائی،
 غلام سازی، قتل و غارتگری، علانیہ جور و جفا اور عالمی امن و سکون کی بربادی

کی بہتات اور پھر یہ سب کچھ بنام امن و صلاح یعنی کھلی عیاری، مکاری، ڈپلومیسی،
 نفاق اور باہمی بے اعتمادی کی وسعت و ہمہ گیری، خلاصہ یہ کہ اس فکر و فریب کی راہ
 سے ان غیر معتدل اور حد و درفتہ عیاشیوں اور حد سے گزری ہوئی مباح کاریوں
 کے پردہ میں بہیمیت کا غلبہ، درندگی کا زور، اور شیطنیت کا استیلا رہی (جو
 ان اسباب تعیش و ہلاکت کی افراط کا قدرتی نتیجہ ہے) برق صاحب کے نزدیک
 نبوت و خلافت کی اصلی غرض و غایت ٹھہر گیا۔ اور اس دنیا داری ہی کو انہوں
 نے ایمانداری قرار دیدیا۔ حالانکہ اس کے مٹانے کے لئے تو انبیاء کی نبوت اور
 خدا کی خلافت دنیا میں آئی تھی۔ پس انہوں نے اپنی برق رفتاری سے نبوت و
 خلافت کی غرض و غایت ہی کو الٹ دیا۔ اور قلب موضوع کے اس الٹ پھیر میں
 آکر ایک نکھرے ہوئے روحانی اور اخلاقی نصب العین کو خالص مادی
 نصب العین بنا دیا۔

لیکن اس مادی نقطہ نگاہ کا نہایت ہی ہلک اور خطرناک نتیجہ ایک تو یہ نکلتا
 ہے کہ اسلام کا قرن اول اور صحابہ مقبولین کا طبقہ معاذ اللہ سب سے زیادہ
 ضعیف الایمان قلیل العلم اور محروم العمل قرار پاجاتا ہے۔ جس نے منشا قرآنی
 کے مطابق نہ ایک مشین بنائی نہ ایک انجن ہی ایجاد کیا نہ دکان و بچار سے کلیں
 بنائیں نہ خوبصورت چھری کاٹنے و ڈھالنے کی کیم اور پاؤ ڈرتیار کئے نہ چہروں کو
 گلگوں بنانے کے لئے غارے اور لیوشن بنائے۔ نہ آرائشی سامانوں کی تخلیق کی۔

نہ ہواؤں میں اڑتے پھرے۔ نہ پانیوں میں بہتے ہوئے دکھائی دیئے نہ کسی نے مہلک آلات ایجاد کر کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کا منہ میں سفایا بولا۔ نہ استعماری اغراض کے ماتحت دنیا میں خیر و استبداد اور ظلم و ستم پھیلایا نہ سائنٹیفک آلات کی طاقت کے بل بوتہ پر قوموں کی علام سازی کی نہ اپنی استعماری اغراض کی خاطر زیر دستوں کے تڑپتے ہوئے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی دنیا کا سرمایہ کھسوت کر آلات لہو و لعب، باجے گاجے، سینما تھیٹر، فوٹو اسٹیشن و منکرات کے مناظر، بے حیائی اور بے حجابی کے عریاں نقتے دنیا میں رائج کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا۔ غرض برقی صاحب کے تجویز فرمودہ منشا قرآنی کے مطابق نہ مشینی تمدن برپا کیا نہ بجلی سے بلڈنگیں جگمگائیں نہ ڈامر کی سڑکوں پر موٹریں دوڑائیں۔ اور نہ خود ہی ان تفریحات و تعیشات کی لائٹوں پر دوڑے۔ اس لئے اسلامی اور قرآنی حیثیت سے قرن اول کی زندگی معاذ اللہ سب سے زیادہ ناکام اور اسلام سے بعید زندگی رہی۔

ادھر اس کے برعکس جوں جوں قرن نبوت سے بعد ہوتا گیا اسی قدر یہ سائنٹیفک ترقیات بڑھتی گئیں۔ گویا عالم قرآنی ترقی کرتا گیا۔ فہم انسان تیز ہوتا گیا اور عمل بالقرآن کا ذوق بڑھا گیا گویا نبوت کے قرن سے بعید ہونا ہی امت کے حق میں رحمت ثابت ہوا۔ کہ سمجھ اور فہم صحیح ہو گئے اور

لوگ ایمانداری کا صحیح صحیح مفہوم سمجھنے کے لائق ہو گئے۔ مگر قرن نبوت کی موجودگی میں امتہ کو فہم و علم اور عمل کے لحاظ سے حرمان و خسراں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ پس برقی صاحب کے ان دعویٰ کردہ مقدمات کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرن اول بلحاظ علم و عمل معاذ اللہ شر القرون ثابت ہو گیا اور یہ آج کا شر القرون خیر القرون بن گیا۔ حالانکہ لسان پیغمبر پر خدائی دعویٰ یہ تھا۔

خَيْرُ الْقُرُونِ قُرْنِي

زمانوں میں سب بہتر میرا زمانہ ہے۔

ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ

پھر وہ لوگ جو خیر القرون والوں سے

ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ

متصل ہوں اور پھر جو ان لوگوں سے متصل ہوں۔

پس کلام نبوی میں تو عہد نبوت کا خیر و برکت اور اس کی وسعت و کثرت کی طرف اور زمانہ مابعد میں رفتہ رفتہ اس خیر و برکت کا قلت اور ضعف کی طرف بڑھنے رہنا بتلایا گیا ہے۔ مگر کلام برقی سے قصہ برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ ادھر کلام نبوی سے تو نبوت عالم کے لئے رحمت ثابت ہو رہی ہے اور کلام برقی سے زحمت ثابت ہوئی۔ قرآن نے تو ایمانداری کا مفہوم علم نافع کے ساتھ حسن اخلاق اور فضائل اعمال قرار دیا تھا جس کا سرچشمہ نبی کی روحانیت ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اس ایمانداری کی ترقی کا اعلیٰ ترین وقت تو زمانہ نبوت اور اس سے قریب عہد اور اس کے تنزل کا وقت نبوت اور اس سے ملحقہ زمانوں سے بعد عہد ہی میں ہو سکتا ہے مگر کلام برقی میں ایمان داری کا مفہوم

دنیا داری یعنی تمدنی ترقیات اور سائنٹیفک ایجادات ہیں جن کا سرچشمہ عقل معاش
 اور خالص ماویت ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کی مرغومہ ترقی تو نبوت سے
 بعد عہد میں اور اس ترقی کی لپٹی یا اس کا وسیلہ محض رہ کر سر بلند نہ ہو سکتا نبوت
 اور اس کے قریبی زمانوں ہی میں ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک امتی کے کلام کو نبی
 کے کلام سے یہ بعد اور نتیجہ کلام میں نبوت سے یہ صریح معارضہ، نتیجہ ہے ذہن
 اور نقطہ نظر کے تاثریت یافتہ رہ جانے اور ذوق کو زینع آئینز چھوڑے رکھنے
 کا نہیں بلکہ برقی صاحب کے اس اصول پر سارے ہی انبیاء علیہم السلام پر حرج
 آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے دور میں مادی اور تمدنی ترقیات تو کیا ہوئیں برپا
 شدہ ترقیات بھی موت کے گھاٹ اتار دی گئیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دور
 خیر و برکت میں تمدنی نعمتات اور عیش دنیا کے گھڑے ہوئے تکلف آئینز
 نشتے اپنی پوری روحانی قوت سے مٹائے ہیں۔ جن کو قائم کرنے میں مادی
 مزاج اور فلسفی طبع لوگوں نے انتہائی کاوش و دماغ اور مستعدی دکھائی تھی۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کلدانیوں کی تمدنی ترقیات پر پانی پھیر دیا
 تھا۔ جو بعض حیثیات سے آج کی تمدنی ترقیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ
 کر تھیں۔ اور لوگوں کو پھر سے اسی سادہ تمدن کی دعوت دی جس میں تکلفات
 اور افراطِ عیش کا وجود نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فراعون
 اور فرعونوں کا وہ ملکی اور شہری گرو فر خستم کو کے چھوڑا جس پر

فرعون اَلَيْسَ بِيْ مَلِكٍ مِّمَّنْ وَهَذِهِ اِلَّا نَهْرٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ دِكْهَمْ كَمَنْ فَرِحَ بِمَا
 کرتا تھا اور انہیں اسی بے تکلف سا وہ تمدن پر لانے کی کوشش فرمائی۔

بنی اسرائیل جب بھی اس تمدن کی تکلف آمیز رنگ رلیوں میں پڑے اور طبعی
 نتیجہ کے طور پر قباد فی الارض میں مبتلا ہوئے۔ جب ہی ان پر عذابِ خداوندی مسلط

ہوا۔ اور دوسری جا بر قومیں سخت نصرتیں روئی وغیرہ ان پر مسلط ہو گئے۔
 اور بنی اسرائیل کو محکوم اور غلام بننے کے سوا چارہ کار باقی نہ رہا اور بالآخر

بھی متنبہ ہو کر انہوں نے اس تمدنی تکلفات اور ان کے خواص و آثار یعنی
 سرکشی اور طغیان کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اسی سا وہ اخلاقی تمدن پر آئے جو ہمیشہ

انبیاء کا تمدن رہا ہے۔ تب ہی وہ اپنے اور ان کے لوان کا گیا ہوا وقار و
 اقتدار بازیافت ہوا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے دو عظیم الشان

مادی تمدنوں یعنی رومی اور ایرانی کو فروغ اور عمرانی عجائبات کو مٹا دینے کا پرواز

ڈالا۔ اور ان کے مرط جانے کی پیش گوئیاں فرمائیں جن کے مطابق آپ کے

پاکباز صحابہ نے عین منتہا نبوی کے مطابق اپنی فتوحات سے ان تکلف آمیز تمدنوں

اور ان کی سرپرست حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا اور وہی سا وہ تمدن قائم کر دیا۔

جو مقاصد عبودیت میں خارج نہ ہو۔ کسی کے دہانت ہال کے بے نظیر سامانوں

علیٰ یعنی کیا میں ملک مہر کا بادشاہ نہیں ہوں؟ اور یہ تہریں میرے محلات کے نیچے سے نہیں بہ

رہی ہیں؟

ما فوق العادہ سیم وزر کے ظروف و تاج اور اعلیٰ اعلیٰ نمودوں کے انمول قالینوں وغیرہ پر جب کہ وہ سلسلہ مال غنیمت مسجد نبوی میں لائے گئے۔ فاروق اعظمؓ روپے اور فرمایا کہ یہی وہ سامانِ نقوش ہے جس کی بدولت فارسی قوم آج مسلمانوں کی محکوم اور مفتوح بنی۔ ڈر ہے کہ یہ سامان کہیں نہیں بھی بتلائے تعیش کیے کسی قوم کے ہاتھ پر مفتوح اور غلام نہ تیار سے ظاہر ہے کہ فاروق اعظمؓ کو یہ ملائیت کی سادگی سے نہ تھا بلکہ اسی معاویہ رضیہ جو تائین جبال اور خزائن بجا کے زلمین سامان تمدن سے کھتا جس کے سامنے ٹیٹا کھونے اس وقت قبصر و کسری نے دنیا کو دکھائے تھے۔ اور آج دنیا میں شرمگش کر رہے ہیں۔

خلفائے راشدین یا ملوک عادل کے زمانوں میں تمدن سادہ اور اخلاقی رہا سامان عیش و نشاط کم سے کم اور سامان ہلاک و تباہی تقریباً مفقود رہا۔ اس لئے اسلامی فتوحات اور دائرہ خلافت کی وسعت و قوت بھی اسی دور کا طرہ امتیاز ہے۔ جول جول عجمیت اور بالفاظ دیگر قیصریت اور کسرویت اور بالفاظ واضح مادیت اور اس کی تعیش آئیں صورتیں پیدا ہوتی رہیں و وول اخلاقی ترقیات کے قدم سست پڑتے گئے اور ہجوم و اقدام کے بجائے کھانے یا ٹٹنے پر تھانہ جنگیال پر چھٹی گئیں اور مسلمان اولاً من حیث المذہب اور پھر من حیث القوم رو بہ انحطاط ہوتے گئے۔ پانسو برس بعد اس تعیش اور تمدنی تکلف نے عربوں کی دولت ختم کر دی جو پھر لوٹ کر نہیں آئی اور دوسرے پانچ سو برس کے بعد تدریج ترکوں کی دولت

سمیٹ دی جو پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں لوٹی اور بالآخر تیسرے پانچ سو کے
 آغاز میں یہ اسلامی قوم نصرانی اقوام کی سنگینوں کے نیچے آئی شروع ہو گئی۔
 جس سے آج تک بھی اسے چھٹکارا نصیب نہیں ہوا ہے گویا عربوں اور ترکوں
 نے جن قوموں سے سائنٹیفک ترقیات اور تمدنی تکلفات کا ورثہ پایا بھتا۔
 بالآخر انہی کی غلامی اور محکومی بھی ورثہ میں پائی اور اب جن اقوام نے عربوں
 اور ترکوں سے رسمی اور نمائشی تمدن و ترقی کا ورثہ حاصل کیا تھا وہ بھی آخر کار
 ان ہی کے انجام کی طرف بڑھتی آ رہی ہیں۔ کسی کی چودھراہٹ ختم ہوئی کسی کا ملک
 گیا۔ کسی کے اقتصادیات گئے اور کوئی خود سے گئی۔ غرض یہ مقدمات ہیں۔
 سب کچھ چلے جانے کے حاصل یہ ہے کہ اقوام کا حدوث و بقا بالآخر اسی
 سادہ معاشرت اور بے تکلف تمدن میں نکلتا ہے جو ان سائنٹیفک ترقیات
 و تعیشتات اور نام نہاد ایجادات کی آلائشوں سے پاک ہو اور بجائے ہوس
 اقتدار اور حرص تعیش کے اخلاقی اور روحانی قوتوں کو برقرار رکھے۔
 شاید برق صاحب کے نقطہ نگاہ سے ان انبیاء کی بعثت اور ان
 کے صحابہ کا اٹھان معاذ اللہ ایمانداری اور اس کے شعبوں کی تخریب کے لئے
 تھا، اگر ایمانداری ہی دنیا داری اور اس کی تمدنی ترقیات تھیں۔ جنہیں مادہ
 کی توڑ پھوڑ سے بمشابہت حق تعالیٰ حاصل کیا گیا تھا۔ تو ان نائبان الہی کو
 اس ایمانداری کے مٹانے اور اس کی جگہ معاذ اللہ بلائیت کی ناواقفی، جہالت اور

منشأ را الہی سے بے خبری کو قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟
غور کیا جائے تو یہ فرق وہی نقطہ نظر اور ذوق و ذہنیت کا ہے، برق
صاحب جس ذوق سے قرآن کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کی رو سے یقیناً اسلام
کا چہرہ معکوس نظر آنا اور اس کے محاسن کا معائب نظر پڑنا ناگزیر تھا۔ انہوں
نے مرعوبانہ ذہنیت سے قرآن کو ملحدان پورپ کے نقطہ نگاہ سے دیکھا
تو انہیں ایمانداری بھی ہلک و نیاداری نظر آئی۔ اگر وہ خیر القرون کے نقطہ
نظر سے دیکھتے تو انہیں ایمانداری انبیاء کی سادہ معاشرت تکلفات اور تلذذات
سے مبرا زندگی اور خدا پرستانہ روحانیت و اخلاقیات میں نظر پڑتی اور ان
کے کلام سے اسلام کا قرن اول اس طرح ضعیف الایمان قلیل العلم اور
محروم العمل ثابت نہ ہوتا۔ لیکن اگر قرن اول کی مقدس شخصیتوں اور اس پاک دور
کی خصوصیتوں سے الگ ہو کر خالص اصولی حیثیت سے برق صاحب کی نام
پر وہ ایمانداری کا یہ نقشہ قرآن کریم پر پیش کیا جائے تو اس کی کھلی کھلی تصریحات
سے بھی یہ آج کی دنیا داری ایمانداری ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی آج کے ہلک
نمدن کی یہ گرم بازاری منشأ قرآنی سے کوئی جوڑ ہی کھاتی ہے۔ بلکہ قرآنی آیتیں
اس نقشے کو سرے ہی سے مٹا ڈالنے کا پروگرام پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن نے
اس عادی دنیا اور خالص مادی گھروندے کو مطلوب یا مقصود زندگی باور کرانے
کے بجائے حقارت آمیز عنواناتوں سے روک کر تے ہوئے ایمانداروں کو اس سے

ہٹانے اور پزار بنانے کی سعی کی ہے۔ کہیں اس نے پوری دنیا کو جس میں برقی
صاحب کے فرمودہ گیس و بخار اور ایجاوات کے نئے سے نئے نمونے سب شامل
ہیں۔ متاعِ قلیل کہہ کر اس کی تحقیر کی جس کا مقصد اس سے بے التفات بنانا ہے فرمایا۔

تَمَتُّ مَتَاعِ الدُّنْيَا قَلِيلٌ

اسے نبی کہہ دو کہ دنیا کا سامان قلیل ہے اور

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى

آخرت متقی لوگوں کیلئے بہترین سامان ہے۔

کہیں پوری دنیا کو لہو و لعب اور بے حقیقت کھیل کو دنیا یا جس پر بے عقل اور طفلانہ

مزاج انسان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ فرمایا۔

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ

یاور کھو دنیا کی زندگی کھیل کو دے

کہیں پوری دنیا کو دھوکہ کی ٹہنی فرمایا جس پر سبک دماغ ہی ٹوٹ سکتے ہیں۔ فرمایا۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْفُرُوقِ

دنیا کی زندگی دھوکہ کی ٹہنی ہے۔

کہیں پوری دنیا کو آفتوں سے ماری ہوئی کھینتی کہا جس کا آغاز سرسبز اور انجام اجاڑ ہو فرمایا۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جو

كَمَا أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ

آسمان سے برس کر زمین کی پیداوار میں شامل ہو

فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ

جس کو انسان اور حیوانات کھاتے ہیں

بِمَا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ

حتیٰ کہ جب زمین کی پیداوار پورے آب

حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ

تاب کو پہنچ گئی اور راستہ پیراستہ ہو گئی

زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ

اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ اس سے

أَهْلَهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ
عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرًا لَيْلًا
أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَهَا حَصِيدًا
كَأَن لَّمْ تَعْنُ بِالْأَمْسِ

فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں تو ہمارا حکم
(عذاب) رات یا دن کے وقت پہنچا پس
تمام پیداوار نیست نابود ہوگئی۔ گویا اگلے
دن کیلئے ان کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔

کہیں پوری دنیا کے حاصل (دن زر زمین) کو صورت بے حقیقت، نمائش بے روح، نمود
پیدا ہو، اور محض ظاہری ٹیپ ٹاپ بتاتے ہوئے شہوت پرستوں کا محبوب بنایا فرمایا۔
زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ
مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ
الْمُقْتَطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ
ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ
عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ

آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے واسطے عورتیں
اولاد اور مال و دولت سونے چاندی نشانی
رگائے ہوئے گھوڑے جانوروں کی
محبت۔ یہ ہے دنیا کا سامان
اور اللہ کے نزدیک ہی ہے
حسن انجام

کہیں لذت دنیا میں منہمک رہنے والوں کے بارے میں جاہل اور احمق ہونے کی تلمیح کی فرمایا
إِنَّ الَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ لِقَاءَ قَادِرٍ رَّحِيمٍ
بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا
وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غٰفِلُونَ
أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ مِنَ النَّاسِ

جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں
رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی
اور مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری
نشانیوں سے غافل ہیں یہی وہ لوگ ہیں

بِسْمَاكَ اللَّهُ يَا كَسْبِيُونَ ۝

جن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ان اعمال

کی پاداش میں جن کے وہ مرکب ہوئے ہیں۔

کہیں لذات دنیا میں منہمک رہنے والوں کے بارہ میں جاہل اور راہمن ہونے کی تلمیح کی۔ فرمایا۔

ذَرَّهُمْ يَا كَلُوا وَتَيْمَّمُوا

ان کو چھوڑ دو۔ کھانے پینے دو مجھے اڑانے

وَيُلِمُّهُمْ الرُّمُلُ فَسَوْفَ

دو باطل آرزوئیں انکو خدا سے غافل بنائے

يَعْلَمُونَ ۝

کہیں دنیا کی مالی فراوانی اور فراخس گویا باصطلاح عوام ننانویس کے پھیر کی

خاصیت گرفتاری لہو و لعب یا بد انجام مشاغل میں پھنس جانا بتلایا۔

الْمُهَيَّبِ الْتَكَثُرُ حَتَّى زُرْتُمْ

غفلت میں رکھاتم کو بہتات کی ترس نے

یہاں تک کہ جا بکھیں قبریں۔

الْمُعْتَابِ

ذخیرہ، ندوزی

کہیں دنیا کے مال کے جمع و اکٹناز۔ ذخیرہ بازی اور آج کی اصطلاح میں سرمایہ داری پر عذاب الیم کی دھکی دی۔

وَالَّذِينَ يَكْتُمُونَ الذَّهَبَ

جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے

وَالْفِضَّةَ وَلَا يَتَفَقَّهُوْنَهَا قُلُوبًا

ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

سَيَبْلُغُ اللَّهُ فَبَشِّرْهُمْ

اے نبی تم ان لوگوں کو دردناک عذاب

يَعْدُ أَبِ الْيَمِّ ۝

کی بشارت سنا دو

کہیں بے تمنا کھانے پینے اور عیش دنیا میں غرق ہو جانے کو بہائم سے تشبیہ

دے کر ان کا انجام جنہم بتلایا فرمایا۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ
الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى
لَهُمْ

یہ لوگ اسی طرح کھاتے پیتے ہیں
جس طرح جانور کھایا پیا کرتے ہیں
ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

کہیں دنیا کے باغ و بہار کی بے ثباتی دکھلا کر اور اس کے سچاریوں کی بد انجامی
دکھا کر عبرت دلائی اور اس سے پیزار بنانے کی ہدایت فرمائی ہے فرمایا
كَمْ قَرْكُومٍ مِنْ جَنَّتٍ وَعَيْمُومٍ
وَنَارُومٍ وَصَقَّامٍ كَرِيمٍ
وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ
كَذَلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا
آخِرِينَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ
السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا
إِذًا مُنظَرِينَ

کس قدر باغات، چشمے اور کھیتیاں
اور عمدہ عمدہ مقامات اور نعمت جس میں
وہ لوگ مزاراڑا رہے تھے چھوڑ گئے۔
اسی طرح ہم نے اس زمین کا وارث
دوسری قوم کو بنا دیا تو ان پر نہ زمین
روئی اور نہ آسمان اور نہ ان کو
کسی قسم کی مہلت دی گئی۔

کہیں اپنے پیغمبر پاک کو ہدایت فرمائی کہ دنیا کی اس چند روزہ ٹیپ ٹاپ
کی طرف کوئی ادنیٰ التفات نہ کریں کہ یہ فتنہ اور بلا ہے۔ بلکہ صرف طلب
آخرت اور فکر عاقبت میں منہمک رہیں۔ فرمایا

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا
مَتَّعْنَا بِهِ أَنْزُلًا مِّنْهُمُ

مت پھیلاؤ اپنی دونوں آنکھوں کو
ان چیزوں کی طرف جو ہم نے ان لوگوں

زَهْرَةَ الْجَبْرِ وَاللَّيْلِ
لِنَفْسِهِمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ
خَيْرٌ وَأَجْلٌ

کو دنیاوی زندگی میں عطا کی ہیں۔ اس
لئے کہ یہ سب کچھ ان کی آزمائش کے
لئے ہے پھر رب کا رزق بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے

یہ دنیا کے اس حصہ کی مذمت تھی جس کا تعلق باہ اور شہوت سے ہے بعینہ اسی طرح
دنیا کے اس حصہ کی بھی قرآن نے مذمت کی جس کا حصہ تعلق جاہ اور سخوت سے
ہے۔ یعنی یہاں کا زور تمکنت، قوت کی حرارت، عددی اکثریت اور اولاد کی کثرت
بھی خدا کی طاقت کے سامنے کچھ نہیں بنا سکتی۔ اس لئے مال کو مقصود زندگی
سمجھ کر اس میں عمر عزیز گنوا دینا بالآخر حرمان و خسراں کا باعث ہے۔ اس لئے
قرآن نے کہیں دنیا کی مادی شوکت و قوت، فراوانی مال و دولت، اولاد و افراد
کی کثرت، اور نفسانی لذت و فرحت کے حصہ سمیٹتے رہنے کو دنیا و آخرت میں بربادی

عمل اور ناقابل تلافی گھانا قرار دیا۔ فرمایا

كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا
أَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَآكْثَرَ
أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا
بِمَخْلَقَتِهِمْ فَاَسْتَمْتَعْتُمْ
بِمَخْلَقَتِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِكُمْ بِمَخْلَقَتِهِمْ فَاخْضَعْتُمْ

جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے
تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال
اور اولاد پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصہ سے
پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے
جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے
حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو ان ہی کی

کَالَّذِي خَاضُوا أَوْلِيَاكَ حِيْطًا
 انْعَالَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَأَوْلِيَاكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝

سی چال - وہ لوگ مٹ گئے ان
 کے عمل دنیا میں اور وہی لوگ بڑے
 نقصان میں ہیں۔

کہیں ان مادی شوکت و قوت کے نظر فریب سامانوں، بینک اور ویلین - ہم،
 گیس اور توپ و تفنگ وغیرہ - اور عددی اکثریت کے لشکروں پر مبتلا بلکہ
 طاقت اخلاق و روحانیت، بھروسہ کر بیٹھے کو انتہائی ضعف اور انجام کی ہلاکت

قرار دیا - فرمایا

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّن قَرْنٍ
 هُمْ أَحْسَنُ أَثَاثًا وَرِثِيًّا
 قُلْ مَنْ كَانَ بِنِي الضَّلَالَةِ
 فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدَدًا حَتَّىٰ
 إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا
 الْعَذَابَ أَوْ إِمَّا السَّبَاعَةَ
 فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ
 شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ
 جُنْدًا

ان سے پہلے ہم نے کتنے ہی لوگوں کو ہلاک
 کر ڈالا جو ساز و سامان اور حسن ظاہری
 رکھتے تھے۔ مگر وہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا
 ہوتے ہیں خدا ان کی رسی کو دراز کر
 دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھوں میں دیکھ
 لیتے ہیں اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا
 گیا ہے۔ عذاب یا قیامت پس وہ لوگ
 جانیں گے کہ کون بدترین از روئے تمہارے اور
 قوت و طاقت کے لحاظ سے کمزور ہیں۔

کہیں دنیا کے ان رسمی رضا کاروں اور مددگار جتھوں کی باہر نگاہ عددی اکثریت کا

کھو کھلا پن ظاہر فرماتے ہوئے ان طاقتوں پر پھر وسہ رکھنے والوں کو ناعاقبت
 شناس اور بالآخر بے بار و مددگار رہ جانے والا بتلایا۔ فرمایا

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَآبِدَ عَدُوِّهِمْ
 فَسَيُعْلَمُونَ مَنْ أضعفُ ناصِرًا
 وَ أَقَلُّ عَدَدًا

یہاں تک کہ جب دیکھیں گے جو وعدہ ہوا
 تھا ان سے سوتب معلوم کریں گے کس کا کمزور
 ہے مددگار اور کس کا کم ہے عدد۔

بہر حال عیش و نشاط کے وافر سامان ہوں یا قوت و شوکت کے مضبوط
 وسائل اسباب رزم ہوں یا وسائل رزم و رہائے متعلق کروفر ہو یا بازار
 سے متعلق سیم و زرابو آج کی نہیں ہمیشہ کی دنیا پرست اقوام کا سرمایہ
 سرور و غرور رہا ہے اور آج اسی سرور و غرور کو تلبیسِ امیرِ عنوانات سے دین و
 ایمان اور خلافت و اطاعت پکارا جا رہا ہے۔ قرآن کے نزدیک بہ دونوں
 ہی شعبے بڑا لایعیا بہ اور انتہائی بے حقیقت ٹیپ ٹاپ ہیں جنہیں مقصود
 زندگی یا دین و ایمان سمجھنا ناعاقبت اندیشی اور ہلاکت کو شئی فرمایا گیا ہے۔

پھر اس بارہ میں قرآن نے محض اصولی ہی دعویٰ نہیں کیا بلکہ واقعات
 کی شہادت سے جگہ جگہ اقوام سابقہ کی تباہی کی مثالیں بھی پیش کیں۔ کہ ان
 چند روزہ بہاروں میں اگر وقتی عیش و لذت کے سرور و غرور میں مبتلا ہو کر اور
 اس تعیش کی افزائش کے لئے دماغی کاوشوں سے اختراعات و ایجادات میں
 غرق ہو کر بڑی بڑی جابر قومیں ان کی آن میں کس طرح برباد کر دی گئیں کہ آج ان

کا کوئی نام و نشان بتلانے والا بھی نہیں قوم نوح طوفان کے تھپیڑوں سے،
 قوم عاد و اٰندھیبوں کے جھکڑوں سے، قوم ثمود و ہولناک گرج اور غیبی چنگھاڑ سے،
 قوم شعیب آسمان کی آتش باری سے، قوم لوط فضا کی سنگیاری اور بستنیوں کے
 الٹ ویٹے جانے سے، قوم ابراہیم سلب نعمت ملک سے، قوم فرعون قلمزم کی
 موجوں سے اس طرح بے نشان کر دی گئیں کہ نہ ان پر آسمان رویا
 نہ زمین۔

مصریوں کی سائنٹیفک ترقیات بے نظیر باغات، خوش نما آبشاریں،
 سرسبز کھیتیاں و لفریب سبزیاں اسباب عیش و نشاط، فرعونی دماغ کے
 مجوزہ سر بفلک منار سے جن کی مدد سے وہ آسمان کے دروازوں کے قریب
 ہو کر موسیٰ کے خدا سے مقابلہ کا جو صلہ کر رہا تھا۔ ان کے لئے کچھ بھی کار آمد
 ثابت نہ ہوئے۔ اور یہی ساری سائنٹیفک ترقیات فرعون اور فرعونوں
 کے جن میں موجب ہلاکت و تباہی نہیں۔ اور بالآخر نام اور کام باقی رہا
 تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کی سادگی و بے تکلفی کا یا با اصطلاح برق
 صاحب خالص ملائیت کا۔

عاد و ثمود کو ان کی سائنسی ترقیات اور فنکاروں کی بہتال تعمیر و ترقی عاد
 کی فن انجینئری کے تحت نادر روزگار سر بفلک بلڈنگیں اور قوم ثمود کی وہ
 پہاڑوں سے تراشی ہوئی قلعہ بند عمارتیں اور منزل در منزل تعمیریں اس

عذاب خداوندی سے بچا سکیں جو اپنی ناشی بہاروں میں غرق ہو جانے کے سبب ان
 پر آیا اور جس کے سبب قرآن نے ان کے خالص ہدایت کے شاہکاروں اور اخلاقی
 و روحانیت سے ہٹے ہوئے کارناموں کو مقصود و زندگانی قرار دے لینے کو نفرت سے
 حقارت سے یاد کیا ہے جس کا مفہوم قطعاً یہ نہیں نکلتا کہ یہی دنیا داری علمین ایمانداروں کی
 ورنہ اس ایمان داری کو بے نام و نشان کر دینے اور رسوائے عالم یاد رکھانے کے
 لئے قرآن کی یہ آیتیں نہ آتیں بلکہ ان اقوام کی سائنٹیفک ترقیات کو سراہا جاتا اور
 عذاب کے بجائے ان پر انعامات الہیہ اترتے۔ قرآن ان کے مناقب بیان کرتا کہ
 انہوں نے مشاہدہ خداوندی کو پورا کیا اور مسلمانوں کو ان سے ہٹانے کے بجائے ہدایت
 دینا کہ وہ ان اقوام کے نقش قدم پر چلیں نہ کہ انبیاء کے جنہوں نے ان کی ان ساری
 ترقیات کو میٹ دینے کے راستے تیار کئے لیکن قرآن نے بتلایا کہ جب یہ مادی
 مشاغل ان کی ایمان داری میں حارج ہوتے اور ان فانی لذات میں پڑ کر ان قوموں نے
 فرائض عبودیت ترک کر دیئے انبیاء کی تعلیمات کو ٹھکرا دیا تو پھر خداوندی سے
 انہیں نیست و نابود کر کے دنیا کو عبرت دلانی کہ ان کے نقش قدم سے ہی دور رہیں
 اور اس راہ نہ چلیں۔ پھر قرآن کو سب سے زیادہ سمجھنے اور اس پر سب سے زیادہ
 عمل پیرا ہونے والی ذات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس ہے۔ آپ
 نے اس بارہ میں جو عملی نمونہ اور استقامتی اسوہ پیش فرمایا۔ وہ حقیقت ہے ہی ان
 آیتوں کا صحیح مفہوم اور سچا مصداق ہے۔ سو آپ نے ان سائنٹیفک اختراعات

اور مادی لذات کو مقصود زندگی سمجھ کر ان میں ترقی کرنا تو بجائے خود ہے
 ان سے علی الاطلاق فائدہ اٹھانا اور لذت اندوز ہونا بھی گوارا نہیں فرمایا۔
 بلکہ بقدر ضرورت اور وہ بھی باختصار ضرورت اور اس پر بھی کمال قلت اور
 اس قدر قلیل کو بھی محض مصلحت دین و روحانیت نہ بلحاظ حفظ نفس اختیار
 فرمایا اور پھر بھی اس سے بے تعلقی کا اعلان فرمادیا کہ

مَالِي وَ لِدِّي نَبِيًّا اِنَّمَا اَنَا
 كَرَّ اَكْبَحِيْلٍ تَحْتِ ظِلِّ
 شَجَرَةٍ (الحج)

مجھے دنیا سے کیا تعلق ہے میں تو ایک گھوڑے
 سوار کی مانند ہوں (جو سفر میں ہوا اور
 دم لینے کے لئے کچھ دیر) ایک درخت

کے سایہ کے نیچے بیٹھ جائے (اور پھر چلنا شروع کر دے پس دنیا ایک چلنا پھرتا سایہ ہے
 اور مسافر آخرت برائے چند سے آثار سفر میں اس کے نیچے دم لے لیتا ہے تاکہ پھر سفر
 شروع کر دے اور بدستور مقاصد عبودیت پورے کرنے میں لگا رہے۔

آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اس پاک ذوق کے ماتحت یہ
 رہی ہے کہ آپ نے بیت نبوت میں کبھی ایک حجرہ نہ روسیم کا جمع رکھنا گوارا نہ
 نہیں فرمایا۔ اتفاق سے ایک بار ایک آوٹھ دینار گھر میں رہ گیا جو آپ کو عین مغرب
 کی نماز کی تکبیر ہو جانے پر یاد آیا تو اسی وقت مصلیٰ سے ہٹ کر گھر میں تشریف لائے
 اسے صدقہ فرمایا اور پھر آ کر نماز شروع فرمائی اور فرمایا کہ بیت نبوت کے لئے زیبا
 نہیں کہ اس پر رات گزرے اور اس میں سونا چاندی ہو۔ گھوڑوں پہینوں دھواں

نہیں اٹھنا تھا اور آپ فقر و فاقہ کو بصد شوق و رغبت عزیز رکھتے اور فرماتے
 اللَّهُمَّ اجْعَلْ مِنْ فِرْقِ الْمُحْتَمِدِ قَوْمًا اے اللہ محمد کے اہل بیت کا رزق قوت لایموت
 ہی رہے جس میں افراط نہ ہو) آپ امت کے فقر و فاقہ اور ناداری سے خوف نہ
 کھاتے تھے۔ بلکہ دنیوی نمول اور دولت واری سے خائف تھے۔ کہ وہ امت
 کے لئے ہلاکت ہے۔ امت کو ہدایت فرماتے کہ اقوام عالم پر تمہارا غلبہ زور و
 مال سے نہ ہوگا۔ بلکہ اخلاقِ محمدی سے ہوگا۔ جمع مال کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ
 اسے بے عقلی کی نشانی فرماتے ہیں۔ حرص مال پر آمادہ نہیں فرماتے بلکہ قناعت پر
 اُبھارتے ہیں۔ بلند عمارات کو پسند نہیں فرماتے اسبت اور بقدر ضرورت عمارت کو
 جائز رکھتے ہیں۔ کسی کی اونچی عمارت دیکھتے ہیں تو گہرائی اور ناپسندیدگی کا اظہار
 فرماتے ہیں اور عمارت والے آپ کے متشا کو پا کر اسے منہدم بھی کر دیتے ہیں انہ وارج
 مطہرات کے لئے تنگ و تاریک حجروں کی معاشرت پسند فرماتے ہیں جن پر کچھور
 کے پتوں کی چھت تھی اور مٹی سے اُسے لپ دیا گیا تھا۔ لباسِ فاخرہ کو ہاتھ نہیں
 لگاتے اور کسی کی خاطر کوئی ایسا لباس ہدیتہ پہنتے بھی ہیں تو گھبرا کر فوراً تار دیتے ہیں۔
 اور وہی اپنی پیوند دار کملی طالب فرماتے۔ لذیذ کھانوں سے بے تعلق رہتے ہیں۔
 اور تفسن طعام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ عمر بھر کے کھانے کی مقدار میں چیند من جو ہیں۔
 جن کا بھوسہ بھی روٹی میں شامل رہتا ہے۔ بچھونے کے لئے فرشِ خاک اور اس پر ایک
 معمولی کمبل زیر پشت رکھتے ہیں۔ دولت کی افزائش کے لئے احتکار دگرانی ترک

کی امید پر ملل تجارت روکے رکھنا، کو روکتے ہیں۔ سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ قمار کو
 ممنوع فرماتے ہیں۔ زکوٰۃ کی ہدیت فرماتے ہیں۔ سیم و زر کے برتنوں کو ناجائز فرماتے
 ہیں۔ دیوار ہائے مکان پر نقش پر دوں کی نمائش کو مکروہ جانتے ہیں۔ سادہ لباس (حلمہ)
 کو شعار بتاتے ہیں اور فیشنوں کی کاٹ تراش سے بے تعلق اختیار فرماتے ہیں۔ دنیا
 کی ٹیپ ٹاپ تو بجائے خود ہی سرے سے دنیا ہی کو پسند نہیں فرماتے۔ دنیا و مافیہا
 کو طعون فرماتے ہیں۔ دنیا کو مومن کے لئے جیل خانہ فرماتے ہیں۔ دنیا کو بے گھروں کا
 گھر فرماتے ہیں۔ دنیا کو مینغوض خداوندی فرماتے ہیں۔ محبت دنیا کو وسیلہ جہنم قرار
 دیتے ہیں۔ غرض ان تمام وسائل تمدن اور مادہ کی سائنٹیفک ترقیات ماکولات،
 مشروبات، مسکونات، ملبوسات وغیرہ میں جن کی خدمت اختراع و اکتشاف
 کے سلسلہ میں سائنس بے تحاشہ دوڑ لگا رہی ہے۔ آپ نے وہ نمونہ عمل
 پیش فرمایا کہ اس میں دنیا طلبی کا مبالغہ تو بجائے خود بے سرے ہی سے دنیا طلبی کا
 کوئی نشان یا دنیا سازی کا کوئی نام یا دنیا بازی کا کوئی اوئی نقش تک نہیں پڑتا۔
 بلکہ تا بحد ضرورت اختیار کرتے ہیں بھی انتہائی تغلیل، انتہائی احتیاط اور انتہائی
 بے تعلقیت کا اسوہ سامنے آتا ہے۔ جس سے قرآن کی عرض کردہ آیات کا مفہوم
 اور مصداق متعین ہو جاتا ہے کہ نثار خداوندی یہ دنیا داری نہیں بلکہ ایمان داری
 ہے جو اس دنیا داری کی ضد ہے۔ چہ جائیکہ یہ دنیا داری ہی عین ایمان داری
 ثابت ہو۔

پھر پیغمبر کی ذاتی زندگی سے جو اعلیٰ ترین عزتوں اور بلند ترین ہمنموں کا مجموعہ ہے ایسے اتر کر بھی اگر اس دنیا داری اور اس کے ان تمدنی مبالغوں کو شریعت کے عام قواعد پر رکھا جائے جن میں دنیوی لحاظ سے توسع اور کافی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ دنیا کی ہر خدا پرست قوم انہیں اختیار کر سکے تب بھی اس پوری دنیا کی حیثیت ایک وسیلہ آخرت سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی جس میں ذاتی مقصودیت اور مصلوبیت و حیوبیت کا کوئی ثابہ نہیں نکلتا ارشاد نبوی ہے -

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَ
بلاشبہ دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے اور
أَنْفُسِكُمْ خُلِقَتْ لِلْآخِرَةِ
نفس آخرت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اس شکل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا تمہاری آخرت کے لئے بنائی گئی ہے۔ یعنی وسیلہ آخرت ہے مقصود زندگی نہیں قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ
میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ
عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔

یعنی دنیا اور دنیا داری کی خاطر پیدا نہیں کیا کہ یہی کلمہ حصر کا مفہوم ہو سکتا ہے اور جب دنیا غایت تخلیق نہیں تو لامحالہ پوری دنیا کا وسیلہ عبادت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایک موقع پر بذیل دعا لسان نبوت میں اس حقیقت کو ظاہر فرمایا

گیا۔ ارشاد نبوی ہے۔

اللَّهُمَّ اَعِنِّي عَلَىٰ دِينِي
بِالدُّنْيَا وَعَلَىٰ اٰخِرَتِي
اسے اللہ میرے دین کو دنیا کے ذریعہ
مدد دے اور میری آخرت کو پختہ
رہا لتقویٰ۔

بہر حال ان نصوص سے دنیا و سبیلہ دین ثابت ہوتی ہے۔ اور عقلی اصول ہے کہ وسائل صرف تکمیل مقاصد کے لئے بقدر ضرورت اختیار کئے جاتے ہیں۔ اگر وہ ضرورت سے بڑھ جائیں یا ضد مقصود کے لئے وسیلہ ثابت ہونے لگیں یا مقصد فوت ہو کر محض وسائل ہی وسائل رہ جائیں۔ گویا تخم تو گل جائے اور پتھر میں پانی ہی پانی رہ جائے جو تخم کے نشوونما کا محض ایک وسیلہ تھا تو یہ شرعاً ہی نہیں عقلاً بھی مذموم سمجھا گیا ہے اور اس میں کاشت اور کاشت کار دونوں کی تباہی ہے۔ گویا یہ تمام سامان دنیا بدن کی پرورش اور بقا کا ذریعہ ہے۔ اور بدن روح کے لئے مرکب اور سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ راہ حق اور آخرت کی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بدن کے اس گھوڑے کے لئے گھاس دانہ فراہم کرے تاکہ وہ سفر کرنے کے قابل ہو۔ پس سفر سے مقصود منزل ہوتی ہے نہ کہ گھوڑا یا گھاس دانہ، اس صورت میں اگر مقصد سفر ہی سامنے نہ ہو تب تو سواری اور گھاس دانہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جس صورت میں مقصد سامنے

ہو تو تحصیل مقصد کی حد تک سواری کا بند و بست کرنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ
 وسیلہ ہی رہتی ہے۔ مقصد نہیں بن جاتی۔



مادی طاقتوں پر پھر و سہ کر سکی بنیادی علت

ہاں پھر اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ منزل مقصود سامنے
 ہو اور سفر کے لئے کوئی دوسرا قریبی وسیلہ ہاتھ لگ جائے تو پھر بے وسیلہ
 کی طرف طبعاً التفات باقی نہیں رہتا بلکہ اسے قریب قریب ترک کر دیا جاتا ہے۔
 غور کیجئے کہ سفر آخرت کی منزل مقصود وصول الی اللہ بلکہ قبول عند اللہ ہے اس
 کے لئے حسب بیان بالا دنیا کے یہ تمام اجزاء مال و جاہ مہتیار، اوزار، افراد کے
 اعداد و شمار اور روٹی و کرسی وغیرہ وسائل ضرور ہیں مگر وسائل بےیدہ ہیں کیونکہ
 منزل مقصود باطنی اور معنوی ہے اور یہ اسباب ظاہری اور مادی ہیں ظاہر و
 باطن اور مادہ و روح میں بہر حال بون بےیدہ ہے۔ اس روحانی مقصد کے لئے
 وسائل قریب جو اسے سامنے لے آتے ہیں قوت یقین، تقویٰ، پیمیزگاری، دیانت
 راست بازی، توکل، محبت حق اتباع طریق انبیاء اور غیر اللہ سے استغفار
 وغیرہ ہیں۔ یعنی مادی طاقت سبب بےیدہ ہے اور اخلاقی طاقت سبب قریب

ظاہر ہے کہ اگر کسی کے پاس یہ باطنی وسائل کی اخلاقی طاقت مضبوط اور منضبط شکل میں موجود ہو تو اسے قدرتنا ان مادی اور رسمی وسائل کی بوجہ کی طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے ان وسائل بعیدہ کی زیادہ حاجت ہی پڑے گی جبکہ وہ وسائل قریبہ سے بہت دور ہے اور منزل مقصود اس سے آگے ہے۔

اس رسمی وسائل کی طاقتوں پر بھروسہ اسی وقت بڑھتا ہے جب اصلی طاقت پاس نہیں ہوتی جیسے کسی شخص کی اصلی صحت قائم نہ رہے تو وہ دواؤں کے بل بوتہ پر اپنی صحت برفرار رکھنے کی فکر میں ڈوبتا رہے اور اس عارضی صحت ہی کو صحت پاور کرنے پر مجبور ہو جائے حالانکہ دواؤں سے حاصل شدہ صحت اصلی صحت نہیں بلکہ ایک مستقل روگ ہے جسے یہ بوجہ غلط مریش مرض سمجھنے سے ظاہر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس کے بدن میں اصلی صحت راسخ ہو وہ نہ صرف دواؤں کو مٹا کر ہی نہیں دیکھتا بلکہ ان سے حاصل شدہ عارضی اور مصنوعی صحت اور اس کے عمل تحصیل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

آج یورپ کے ہاتھ میں اخلاقی طاقت نہیں اس لئے اسے ان مادی وسائل میں غرق ہو کر ان مصنوعی اور سطحی اور عارضی طاقتوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے پاس اخلاقی کی معنوی قوت اور یہ اصلی طاقت ہوتی تو وہ یقیناً اس مصنوعی اور بناوٹی طاقت کے قریب میں مبتلا نہ ہوتا۔ دنیا طبعاً اس کے ہاتھ میں مسخر ہوتی اسے جبراً اور کہہ کر یا مسخر کرنے اور ان آہنی تقریبی اور طلائعی وسائل

کے زور سے اسے دباتے رہنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مسلم قوم کو یہ
 مصنوعی طاقت مستند اور مضبوط شکل میں دی گئی تھی اس لئے اس نے اپنے
 ابتدائی اور بعض درمیانی دوروں میں جب کہ اس کی یہ اصلی صحت قائم
 تھی۔ چلنے بھنی تاریجی کارنامے انجام دیئے۔ وہ ان مادی وسائل سے بالاتر
 اسباب یعنی اسی اسلانی طاقت کا اثر تھے جس میں نہ افراد کے اعداد و
 شمار بنیاد کار تھے۔ نہ سیم و زر اصل تھا نہ ان چیزوں کا وجود ضروری تھا۔
 یہ وسائل بقدر حاجت استعمار کے ساتھ اختیار کر لئے جاتے تھے تاکہ
 عبودیت و بندگی کی شان ظاہر میں بھی قائم رہے۔ اس حقیقت کو نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

أَنْتُمْ كُنْتُمْ تَسْعَوْهُمْ
 بِأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ تَسْعَوْهُمْ
 بِأَخْلَاقِكُمْ

تم دنیا کی اقوام پر اپنے اموال (مادی وسائل)
 سے غلبہ نہیں پاسکتے بلکہ اپنے اخلاق
 سے غالب آسکتے ہو۔

جوں جوں مسلمانوں میں سے یہ اصلی صحت و قوت جو ان کے اسلامی مزاج کے
 اغترال سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جس کا جامع عنوان "فکر احرار" تھا کم ہوتی گئی۔
 ووں ووں وہ بھی عام دنیا کی طرح اپنی عافیت و صحت مندی اپنی آہنہ اور
 تقرنی و ظلالی وسائل کی دواؤں میں مضمحل سمجھنے لگے۔ جو حقیقتاً ان کی نہیں بلکہ
 دوسروں کی طاقت تھی اور بلحاظ حقیقت وہ طاقت نہ تھی بلکہ بصورت طاقت

مکڑوری تھی اور وہ بھی چند روزہ بہار کی ماہند بالآخر خرمان و خسران تھی۔
 کیونکہ بلا فکر آخرت دنیا کے محض نہ تو دنیا ہی ہے کہ دنیا بہر حال رہنے والی
 نہیں اور نہ وہ آخرت ہی ہے کہ آخرت بنانے کی اس میں فکر ہی نہیں۔ اس
 لئے نہ دنیا رہی نہ آخرت

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَلِكُمْ
 هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ
 دنیا اور آخرت میں نامراد ہوا، یہی
 صریح نقصان ہے

مگر جب تقالی کے طور پر مسلمانوں نے بالآخر اس صنعت ہی کو اپنی طاقت سمجھ
 لیا اور عام دنیا والوں کی طرح اس کے پیچھے ہو گئے تو ان کی بنیاد کھوکھلی ہوتی
 گئی اور باطل کی یہ وہی ہوئی اور مصنوعی طاقتیں جنہیں مسلمانوں کی اخلاقی
 طاقتوں نے وبا دیا تھا۔ ان کے مقابلہ پر ابھرنے لگیں اور باطل پرستوں
 نے فرصت پا کر اور مادی وسائل کا وہی قیصری و کسروی حربہ یعنی مادی طاقت
 جسے اسلام کی روحانی اور اخلاقی طاقتوں نے پامال کر دیا تھا اختیار کر کے
 آگے بڑھا دیا۔ اور اسے ترقی دی اور جب اخلاقی قوتوں سے اس کا معارضہ
 کرنے والا ہی کوئی نہ رہا تو اس کا حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ نتیجہ یہ
 ہوا کہ آج کے غافل اور محروم اخلاق مسلمان ان مادی طاقتوں کے نیچے اس
 حد تک دب گئے کہ ان کے ذہن سے اخلاقی قوتوں کے قوت ہونے کا تصور
 بھی جاتا رہا تا آنکہ وہ اپنی مدد و عیبانہ ذہنیت اور ذہنی غلامی سے خود ہی اپنی اس

موروثی طاقت پر طعنہ زن ہونے لگے۔ جس نے کل تک خود ان بناوٹی طاقتوں کو مرعوب کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ آج ان کے ذہنوں میں فہم کے المٹ جانے سے قرآن کا مقصد بھی نہیں بناوٹی اور مصنوعی طاقت محسوس ہونے لگا۔ خلافتِ الہی کے معنی بھی انہی رسمی مصنوعات میں اٹھناک اور غرقابی رہ گئے۔ وینداری اور ایمانداری بھی یہی دنیا داری قرار پاگئی۔ منشا خداوندی بھی یہی سائنٹیفک آلات و وسائل بن گئے۔ پسندیدہ الہی بھی وہی تو ہیں قرار پاگئیں جو ان وسائل کی بندگی اور پابوسی میں سر بسجود ہیں۔ اور مرضی الہی بھی وہی ترقی ہو گئی جو آج ان مادی اقوام کے ہاتھوں ان مادی وسائل سے سطح دنیا پر نمایاں ہو رہی ہے۔ جس کا حاصل دنیا کی اقوام پر جبری تغلب و استیلا کر کے اقوامِ عالم کو دبانانا اور انہیں بلبلا دینا ہو اور بیکہ کر تفریحی ٹھٹھے اور تہمتے لگانا ہے۔ ورنہ اگر ان اقوام کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین مثلاً تہذیب نفس یا تکمیل اخلاق یا اصلاحِ عالم یا خدائی کمالات سے اشکالِ نفوس یا معرفت ذات و صفات خداوندی یا اصول الی اللہ اور قبول عند اللہ یا استدلال و آخرت یا اقامت دین یا حکمرانی قانون الہی وغیرہ ہوتا۔ جو کبھی مسلمان کے سامنے تھا تو طبعی طور پر تغلب و استیلا کے ان تباہ کن وسائل اور نفوس انسانی کو لہو و لعب اور غفلت میں جھونک دینے والے تفریحی وسائل یا تو درمیان ہی میں نہ آتے۔ یا کسی حد تک دفعِ فتنہ کے لئے آتے تو ان میں مبالغہ و غلو اور مقصودیت کی یہ شان نہ آتی کہ دنیا کی ساری تجارتیں

اور عالم کا ارب با ارب روپیہ انسانوں کی تعمیر کے بجائے صرف انہی مہلکات
 کی پیداوار کے لئے رہ جاتے۔ اور بالذات یہی چیزیں مقاصد حیات کا وسیع
 حاصل کر کے خلافت الہی اور ایمانداری کا لقب پالیتیں جس سے حقیقی
 ایمانداری اور خلافت حق پیچھے رہ جاتے۔ پس قرآن و سنت نے دنیا کی نعمت
 کرتے ہوئے اسے بالاصالت مقصود بنا لینے اور اس میں مبالغہ و انہماک سے
 ہے البتہ بقدر ضرورت اور وہ بھی وسیلہ آخرت اور خاوم دین کی حیثیت
 سے کسب کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی جس میں کم و بیش کی تخصیص نہیں کی۔ اگر
 بضرورت دین بالکل اسی قسم کا تمدن اور تمدنی وسائل درکار ہوں جو آج کی دنیا
 پر چھائے ہوئے ہیں تو وہ ضرور حاصل کئے جاویں گے۔ کیونکہ اسلام ان وسائل
 سے نہیں روکتا۔ بلکہ انہیں قبلہ مقصود بنانے سے روکتا ہے پس انتہائی مقصود دین ہوگا۔ اور
 یہ وسائل تحصیل مقصد کے ذرائع ہوں گے نہ کہ خود بذاتہ مطلوب اور ظاہر ہے کہ اس نکھرے
 ہوئے تصور کے بعد یہ غلو آمیز ترقی اور اس پر فخر و مباہات کی صورت قدرتاً پیدا ہی نہیں ہوگی پس
 کہاں بلخدان مغرب کی دنیا پرستی اور اس پر فخر اور کہاں موحدان اسلام کی خدا پرستی اور دنیا گزراہی

ع۔ ش۔ شتان بین مشرق و مغرب

رہیں وہ آیات و روایات جس میں کائنات کی مصنوعات یا تخلیق کے
 عجائبات اور آسمان و زمین وغیرہ کی گونا گوں پیداوار عناصر و مواد ایدار و ثوابت

عہ اس میں مشرق و مغرب کا ساتھ اور فرق ہے۔ ۱۲

و سیارات وغیرہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ سو وہ فن سائنس سکھانے اور اس میں
 موثر گانیاں کر کے صنعت و حرفت کا کار و بار جاری کرنے کے لئے نہیں اتاری
 گئیں بلکہ صنایع الہی میں بحیثیت نظرون کردے کہ معرفتہ خالق کا سراغ لگالینے کے
 لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی یہ کائناتی قرآن (آسمان و زمین برق و بخار آب و ہوا وغیرہ
 و موبد اور ان کے افعال و خواص وغیرہ) جن کو برق صاحب نے عملی قرآن
 کہا ہے۔ اس علمی قرآن کا وہ مطلوبہ عمل نہیں جس کا بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہے
 کہ وہ قرآن پڑھ کر اس کائناتی صنعت و حرفت کا کار و بار پھیلائیں۔ کیونکہ یہ
 تو قرآن اتارنے والے کا عمل ہے۔ جس کی ان آیتوں نے خبر دی ہے۔ ان
 میں یہ مطالبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان حکایتوں کے محلی عنہ کے مماثل کوئی
 صنعت بنائیں گویا بندے بھی خدا کی طرح ایک زمین و آسمان تیار کریں یا چاند
 سورج بنا لائیں بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ خدا کی ان عجیب العقول عجائبات میں سلامتی فکر
 کے ساتھ تدبر کر کے بنانے والے کی طرف نیاز مندانه اور معتزفانہ رجوع کریں
 پہچانیں۔ اور یقین کریں کہ یہ مصنوعات وہی بنا سکتا ہے جس کی قدرت لا محدود
 ہے۔ نہ وہ انسان جس کی قوانین نہایت محدود اور ضعیف ہیں۔ اور اس
 طرح بندے اس کی اس مافوق العادت صناعت سے اس کی خدائی کے قائل
 اور معترف نہیں۔ اور اس کے محسانہ حقوق پہچان کر ان کی ادائیگی کی فکر کریں۔
 پس یہ کائنات آیات قرآنی کے مطلوبہ عمل کی عمل گاہ نہیں بلکہ عارف مزاج

انسانوں کے لئے ایک فکرگاہ ہے جس میں غور و تدبیر کرنے سے قرآن کے نظریات چل ہوتے ہیں۔ اور قرآنی و عادی کے لئے ایسے تمثیلی اور بہانی دلائل ہاتھ لگتے ہیں۔ جن سے قرآنی مقاصد باسانی ذہن میں اتر جائیں۔

بالفاظ دیگر قرآن ایک دعویٰ ہے اور کائناتِ عالم اس کے لئے ایک عادل گواہ ہے جس کی شہادت سے یہ دعویٰ ثابت اور واجب التسلیم ہو جاتا ہے۔ یعنی قرآن کے ذہنی مقولات کو اس کائنات کے محسوسات سے تمثیل دے کر باسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شہادتِ خود مقصود و بالذات نہیں ہوتی بلکہ اثبات مدعا اصل مقصود ہوتا ہے جس کے لئے شہادت لائی جاتی ہے اور جب دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے تو گواہوں کو تو سخت کر دیتے ہیں۔ اور ثابت شدہ دعویٰ کو نافذ العمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس شہادتِ خود دعویٰ کا عمل نہیں ہوتی۔ بلکہ بوجہ اثبات مدعا وسیلہ عمل یا معین عمل ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح صحیفہ کائنات کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ اللہ کے دعویٰ اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کو اس کے ذریعہ نظری طور پر سمجھ لیا جائے اور اس تمثیلی برہان سے متقولات قرآنی کو مثل محسوسات کے یقینی اور قطعی سمجھ کر عقیدہ بنایا جائے اور پھر اس کے مقتضیٰ کو واجب العمل تصور کیا جائے۔ اور جب یہ دعویٰ ان حسی دلائل سے مبرہن اور مدلل ہو جائے تو اس کائنات سے تو قطع نظر کر لی جائے اور ان ثابت شدہ

ہدایات کے فشر کے مطابق عملدرآمد جاری کیا جائے۔ پس قرآنی عمل وہ ہوگا۔ جو ان تکوینی آیات کا تقاضا کر رہا ہوگا۔ نہ وہ جو ان آیات کا کجی عنہ اور واقعہ ہوگا کہ وہ محض دلیل ہے نہ کہ ہدایت اور دعائیں کائنات کی کھود کھود کا مطلب اس کا نظری اور استدلالی تجزیہ ہے جس سے اثبات دعا کے مفادات پیدا ہوں نہ کہ حسی تجزیہ کہ اس کے عنصر یا تہی اجزا کی کھود کھود کے اس جیسی کائنات بنائی جائے اور اس میں جوڑ توڑ کر کے تمدنی اشیاء کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے تیار کئے جائیں کسی عدالت میں گواہوں کے پیش کئے جانے کا مطلب ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کے اقوال و شہادات کا تجزیہ کر کے ان کی ہیئت کذاتی کو سامنے لا کر دعویٰ کے صحیح جھوٹ کا پتہ لگایا جاتا ہے نہ یہ کہ ان گواہوں کی ہڈی لہری توڑ کر ان جیسا ایک پتلا اور تیار کیا جائے یا اس کے اجزا ترکیبی میں جوڑ توڑ کر کے مختلف سامان بنا لئے جائیں جس سے نہ گواہ باقی رہے نہ دعویٰ۔ پس آیات کائنات ان آیات قرآنی کے لئے دلائل اور گواہ ہیں نہ کہ ان کا عملی نمونہ یا عمل کا مادہ

دوسرے معنی ان سے بطور خلاصہ کلام یوں سمجھو کہ قرآن حکیم کی آیتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک انشائی ہیں جن میں کسی چیز کا امر نہی کیا گیا ہے۔ اور دوسری اجباری ہیں جن میں داعی یا مستقبل کے واقعات کی خبریں دی گئی ہیں خواہ افعال عبادتوں یا افعال رب العباد۔ ان دونوں ہی قسم کی آیتوں کا مقصد انسان کو عملی زندگی

کی طرف لانا اور کسب سعادت کی طرف متوجہ کر کے ان ہر دو آیتوں کے تقاضوں
 پر چلانا ہے۔ برق صاحب تو ان آیات پر چلنے کا مطلب خدا کی نقل اتارنے
 اس جیسا کام کرنے اور اس کی مماثلت کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک
 قرآن کا عمل ہی یہ کائنات ہے جو خدا کا فعل ہے اس لئے و محالہ قرآن پر عمل کرنے
 کا مطلب خدا کے مماثل کام کرنے کا ہو جائے گا۔ اور ہم اس آیات پر چلنے کا
 مطلب ان کے تقاضوں سے پیدا شدہ احکام پر عمل پیرا ہونے ان کے مطالبوں
 کو پورا کرنے اور ان کے مقتضیات کے اتباع کرنے کا لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے
 نزدیک قرآن کا مطالبہ کردہ عمل یہ کائنات یا اس کا ماورہ نہیں بلکہ اس کا مطلوبہ
 عمل بندہ کے وہ نیاز مندانه اعمال ہیں جو ان آیات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے
 رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلا مطلب یعنی مماثلت افعال خداوندی ہمارے
 نزدیک جو جوہ مذکورہ صرف باطل ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل بھی ہے۔ جس کی
 طلب قرآن حکیم جیسی فطری کتاب میں کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر حسبِ نعم برق
 صاحب بمقتضائے آیات تکوین خدا کی جیسی صنعت کالے آنا مقتضائے قرآنی
 ہوتا تو جیسے ان اخباری آیات کا مقتضی یہ ہوتا کہ اس کی جیسی ایک کائنات
 ہم بھی بنائیں جس کی حکایت یہ اخباری آیات کر رہی ہیں۔ ایسے ہی اثنائی آیات
 کا مقتضی یہ ہونا چاہیے کہ اس کے جیسا علم اس کے جیسا قانون جو اسی کی جیسی
 جامع بلیغ اور اعجازی تعبیر پر مشتمل ہو ہم بھی بنائیں جس کی حکایت پر یہ اثنائی

آیات مشتمل ہیں۔ گویا بالفاظ مختصر اخباری آیات کے تحت تو ہم ایک متماثل کائنات بنائیں اور انشائی آیات کے تحت ہم ایک متماثل قرآن بنائیں لیکن اگر تشریحی آیات کا مثل لانا ممکن نہیں کہ وہ معجزہ ہے تو تکوینی آیات کا مثل لانا بھی ممکن نہیں کہ یہ بھی معجزہ ہے۔ وہ علمی معجزہ ہے یہ عملی معجزہ ہے۔ وہ اللہ کا اعجازی کلام ہے اور یہ اس کا اعجازی کام ہے اور معجزہ کے معنی جبکہ یہ ہیں کہ وہ بشر کی قدرت سے خارج ہو خواہ علمی ہو خواہ عملی تو ظاہر ہے کہ حکیم مطلق کے کلام میں ایسی چیز کی طلب ہی محال عقلی ہے۔ جو مخاطب کی قدرت سے خارج ہو بلکہ اگر غور کرو تو انشائی آیات میں جہاں مماثلت کے یہ معنی نہیں بن سکتے کہ ہم ان ہی جیسی آیتیں بنالائیں اور خدا کے جیسا کلام کرنے لگیں۔ وہاں مماثلت کے یہ معنی بھی ممکن نہیں کہ جیسے یہ انشائی آیتیں اللہ کے امر و نہی پر مشتمل ہیں جن سے اس کا فعل تشریح اور وصف شاریعت کھلتا ہے۔ ہم بھی ویسا ہی امر و نہی کرنے لگیں اور شارع بننے لگیں کہ

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ
سوائے خدا کے کسی کا حکم نہیں۔

لیکن اگر برق صاعقہ کا یہ اصول مان لیا جائے کہ آیت جس چیز کی حکایت کرے اسی کو بنا کر لے آیا جانا اس آیت کی تعبیر ہے نہ کہ اس کی ہدایت یا مقتضایہ پر عمل کرنا تو جس آیت میں اللہ کے شارع ہونے کی حکایت ہے وہاں مخاطب کو شارع بن جانا چاہیے۔ جن آیات میں اللہ کے آسمان و زمین بنانے کی حکایت

ہے وہاں مخاطب کو زمین و آسمان بنانا چاہیے۔ جن آیات میں معذرت توام
 کی بد عملیوں کی حکایت ہے وہاں انسان کو بد عمل ہو جانا چاہیے۔ یعنی جو حکایت
 ہو وہی عمل بھی ہو۔ سو ظاہر ہے کہ اس کا بدیہی البطلان ہونا کون نہیں محسوس کرے
 گا؟ کیونکہ اس میں اخباری آیتوں میں تو فعلی معجزہ کی طلب لازم آتی ہے اور انشائی
 آیتوں میں کلامی معجزہ کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اور یا شارع بننے کا مطالبہ
 لازم آتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں غیر معقول ہی نہیں ناممکن بھی ہیں۔ مگر یہ سب
 کچھ لازم آ رہا ہے۔ برق صاحب کے اصول مذکورہ پر جس کو انہوں نے آیات
 اخبار اور معاملات تکوین میں اختیار فرمایا کہ جو آیت کا محکی عنہ ہو وہی اس کا
 موجب بھی ہو کہ اسی کو بعینہ عمل میں لانا آیت کی تعمیل ہو۔ اس لئے اس
 اصول کا اصولاً بھی باطل اور غیر معقول ہونا واضح ہو گیا۔ اور آیات تکوین میں
 مماثلت افعال خداوندی کے معنی لئے جانے بانکل ہی مہمل اور بے معنی
 ثابت ہوئے۔

ہاں اگر مماثلت کے معنی قدرتی یا غیر اختیاری تشبیہ کے ہیں کہ ہم
 جب باذن الہی مادہ کو توڑ پھوڑ کر اس کی صنعتی ترکیب و تکمیل سے
 ضروریات زندگی اور اسباب معاش کا استخراج کریں گے تو اس سے
 قدرتی طور پر افعال خداوندی سے فی الجملہ مشابہت لازم آجائے گی یعنی
 مقصود اسباب معاش پیدا کرنا ہوگا نہ کہ تشبیہ بالخالق پیدا کرنا تو اس سے

ہمیں انکار نہیں مگر یہ اصلاً حاکمیت نہیں بلکہ انتفاع اور کسب معاش ہے جو جائز ہی نہیں واجب ہے جس کا امر کیا گیا ہے۔ مگر وہ امر خود ان آیات تکوین سے ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے جداگانہ مستقل احکام اور حدود ہیں جنہیں ترتیب سے اپنے موقع پر واضح فرمایا ہے۔ ان آیات کا ثبات کا حاصل اور تقاضا صرف فکر و تدبیر اور مصنوع سے صنائع پر استدلال کرنا اور خالق کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ پس ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کائناتی مادوں سے انسان صنعت و حرفت کے ذریعہ ضروریات زندگی پیدا کرے۔ کہ یہ خود ماہور ہے۔ انکار اس سے ہے کہ ان آیات تکوین کا مٹنا صنعت و حرفت کی ترقی یا ان کا تجارتی کاروبار پھیلا نا نہیں جس کا دعویٰ بوق صحت کر رہے ہیں۔ ان آیات کا حاصل تکوینی دلائل سے معرفت خالق ہے۔ چنانچہ ان آیات میں جگہ جگہ مصنوعات الہیہ اور تخلیق خداوندی کے نمونے زمین، آسمان، بجلی، ہوا، پاول، آگ، حیوان، انسان، جمادات۔ نباتات اور ان کے طبعی افعال و خاصیات وغیرہ پیش کر کے ہر جگہ آخر میں صرف یہ کہتے پرتنا کی گئی ہے کہ ان میں اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں پوشیدہ ہیں مگر کن کے لئے؟ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ لِقَوْمٍ سُبِيحُونَ لِقَوْمٍ يَتَذَكَّرُونَ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ یعنی ان میں نشانیاں ہیں، عقلا کے لئے ہنکار کے لئے، سمع و طاعت والوں کے لئے، بیدار مغزوں کے لئے اور خواہشمندوں

کے لئے کیونکہ ظاہر سے باطن کا پتہ لگانا، صورت سے ماہیت کا سرخ نکال لانا اور ہیئت سے حقیقت تک پہنچ جانا ہی عقل، تدبیر، دانش، ہوشمندی، فکر، سما اور بیدار مغز ہی کا کوشمہ ہو سکتا ہے۔ گویا مادہ کا منسوی تجزیہ کر کے اس سے علم پیدا کرنا اور وہ بھی علم حقیقت۔ اور پھر اس سے حقیقت المتخالق تک جا پہنچنا بلاشبہ اونچی عقل۔ اور اعلیٰ دانائی ہی کا کام ہے۔ یہی قدرت کی وہ بڑی نشانی ہے جس کو اہل عقل ان تکوینیات میں سے نکال لاتے ہیں۔ لیکن مادہ کی صورت توڑ پھوڑ کر چھری کانٹے بنا لینا، ریل، موٹر چلا لینا، برق و سجاد سے لوہے کی کلیں ہلا دینا۔ اور مختلف قسم کی صنایعیاں، برروسے کار، لاکر بازاروں اور وکانوں کو تجارتی مال سے پاٹ دینا..... اور اس سے سرمایہ دارین کو اینٹھ مروڑ سے رہنا آختر کون سی ایسی بڑی نشانی تھی جو قرآن کے اترے بغیر کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی؟

قرآن جب تک نہیں اترا تھا جب بھی تو ہر قوم اپنے مناسب حال و مزاج۔ اور ضروریات وقت کے لحاظ سے ان ساری صنعتوں میں ترقی کر رہی تھی۔ عاود و نمود کی حیرت ناک مدیت کے کارنامے ان کے بعد کلدا نیوں۔ قوم ابراہیم کی طلسماتی ترقیات، ان کے بعد رومیوں اور ایرانیوں کے اعلیٰ ترین تمدنی عجائبات نیز اور دوسری اقوام کی عجیب العقول مادی صنایعیاں قرآن ہی کے

بیان کے مطابق اس کے نازل ہونے سے کہیں پہلے سے موجود تھیں۔ ان کا وجود قطعاً قرآن کے نزول پر موقوف نہ تھا۔ ہمیں بلکہ سرے سے نبوت پر بھی معلق نہ تھا بلکہ ایسی ترقیات زیادہ تر کی ہی ان اقوام نے ہیں جو نوبتوں سے بیزار اور آسمانی کتابوں کا مذاق اڑانے والی تھیں۔ پس یہ تمدنی صنعت گری کوئی ایسی چیز تھی کہ اگر قرآن نہ اترتا تو وہ روزمانہ ہوتی؟ کیا برقی صاحب اس کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ کہ یورپ کے ترقی یافتہ یا تہذیبوں نے یہ مادی ترقی قرآن پڑھ پڑھ کر کی ہے۔ اور کیا انگلستان، امریکہ، جرمنی اور جاپان وغیرہ کے مشین کاری خانے سورہ بقرہ اور آل عمران سے مستنبط کئے گئے ہیں تاکہ آج کے مسلمان بھی قرآن پڑھ پڑھ کر ٹیکنیکل کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھیں اور ان میں بڑھیں چڑھیں؟ آج بلحاظ یورپ قرآن ہی کو نہیں، سرے سے نبوت ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی اپنے خیال میں کسی حد تک کسی نبی یا کتاب کو ماننا بھی ہے تو صرف ادب و انشاریا نظر و فکر کی حد تک۔ معاملہ کی حد تک اسے کلیتہً ٹھکرائے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی کون سی صنعت و حرفت یا مادی ترقی اس بے عملی سے رکھی ہوئی ہے کہ ان کی ترقیات کو قرآنی عمل پیکار اجائے۔

پس قرآن کا برعکس برقی صاحب بڑے شد و مد سے ایسے امور پر توجہ دلانا جو سرے سے اس کے وجود و نزول ہی پر موقوف نہ تھے۔ اور ایسے بتدل علوم لاکر پیش کرنا جو پہلے سے معلوم عوام تھے۔ اور ایسی ترقی کو اپنی ترقی کہنا

جو اس کو ٹھکرا دینے والی تو میں اس کے برعکس عمل پیرا ہو کہ بھی کہہ رہی ہیں اور
 کرتی آرہی ہیں کہ نہ ایسا عظیم کارنامہ تھا۔ کہ قرآن سزا دینا اور مفکروں کے سامنے
 بطور آیات قدرت پیش کرنا؟ اس لئے ان آیات قرآنی کی پیروی کے معنی افعال خداوندی کے
 ساتھ کسی راوی مماثلت یا مشابہت کے ثابت ہو ہی نہیں سکتے۔ کہ انہیں مدلولات قرآنی
 کہا جائے بلکہ یہ صرف تفسیر بالرائے اور ایک ذہنی اختراع ہے جسے قرآن کے سرزبر تھی تو پورا جبار
 وَكُلُّ يَدْعَىٰ مَبَالِغِی ۚ وَیَسْئَلُ لَاتَقْرَأُ لَهُمْ یَذٰلِكَ

پس جبکہ قرآن کی اخباری آیات کی پیروی اور اس میں چھپی ہوئی نشانی سے
 عملی زندگی بنانے کا مطلب نہ مماثلت نکلتا ہے نہ تشبیہ بالخالق جو برق
 صاحب کا منصوبہ تھا۔ تو پھر وہ کون سی عظیم اور عبرت ناک چیز ہے جو ان اخباری
 آیتوں کے ذریعہ انسانوں تک پہنچانی مقصود ہے؟
 اگر دل کی گہرائیوں سے غور کیا جائے تو وہ مقصد بجز کسی علمی اور عرفانی مقصد
 کے کوئی صنعتی اور تجارتی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اور وہ علم و عرفان بھی کائناتی مخلوق
 یا مواد و عناصر کا نہیں کہ اس کے لئے صرف حیوانی حس کافی ہے۔ کسی علم اعلیٰ یا
 عقل اعلیٰ کی ضرورت ہی نہیں بلکہ وہ علم و عرفان خالق کائنات ہی کی ذات صفا
 اور حقائق الہیہ کا ہو سکتا ہے کہ نہ اس سے بڑھ کر کوئی علم اعلیٰ ہے نہ کوئی معرفت
 اونچی ہے اور بلاشبہ قرآن ہی کے لئے زیبا تھا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے
 لئے اترے۔ اور پوری شد و مد سے قدرت کی ہزاروں حسی اور معنوی آفاقی

سے اور ہر شخص لیلیٰ کی محبت کا مدعی ہے مگر لیلیٰ اس کا اقرار نہیں کرتی۔

اور انہی نشانیوں کو اگلے اچھوتے انداز میں یہ اعلیٰ ترین مقصد سمجھائے جس کی نظیر سابقین میں نہ ملے تاکہ اس کے علمی اعجاز اور عرفانی انداز کا آج کی متمدن اور ترقی یافتہ دنیا بھی لوہا مانے بغیر نہ رہ سکے۔ اور خدا کی حجت اس دور کے انسانوں پر تمام ہو جائے۔

پس ان تکوینی آیات سے وحقیقت نظر و فکر اور استدلال کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے تاکہ آدمی مخلوق سے خالق کی طرف اور مصنوعات سے صانع عالم کی طرف متوجہ ہو اور ساری کائنات کو آئینہ جمال حق بنا کر اس کے ذریعہ سے حق اور کمالات حق کا مشاہدہ کرے۔ اس کی عظمت اپنے دل میں بٹھلائے اور اس معرفت کو جو ہر نفس اور صفت قلب روح کر کے جب آخرت میں پہنچے تو خالق اس کے سامنے عیاں ہوں اور حقیقت الحقائق کا عینی مشاہدہ اسے میرا آ جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات قرآنی کے علوم کا عمل یہ مادی تصرفات نہیں جو غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسی لئے اس کائنات کو عملی قرآن کہہ دیا گیا۔ بلکہ ان خدائی تصرفات میں غور و فکر کے استدلال کے ساتھ معرفت خالق کا عقیدہ دل میں جمانا اور معرفت نفس کی تکمیل کر کے اس کی قوت عملیہ کو مضبوط بنا ہے۔ تاکہ وہ اللہ کے اوامر و نواہی والی آیتوں کی تعمیل کے لئے مستعد اور ہمہ تن شوق بن کر عملی میدان میں آجائے۔ اور اس طرح اس کی قوت عملیہ کی

تکمیل ہو جائے۔ پس یہ آیتیں درحقیقت قلب کے لئے تو اس عرفانی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام عقیدہ ہے اور قالب کے لئے اس حسی عمل کا تقاضا کرتی ہیں جس کا نام عمل صالح ہے اور جو قرب الہی کے درجات پر انسان کو چڑھاتا ہے۔ یعنی کوئی آیت تو مصنوعات الہیہ پیش کر کے وجود صالح کے عقیدہ کو بدلائل دلوں میں راسخ کرنا چاہتی ہے۔ کوئی آیت قدرت کی تکوینی نشانیاں دکھلا کر اس کی توحید کا عقیدہ دلوں میں جمانا چاہتی ہے۔ پھر کوئی آیت اس کا کمال صناعی پیش کر کے اس کی ترمیمیہ و تقدیمیہ کا عقیدہ سامنے لاتی ہے۔ اور کوئی آیت اتقان صنعت سامنے لاکر اس کی حمد و ثنا کا جذبہ ابھارنا چاہتی ہے پس ان آیات کا مقتضا اور تقاضا کہ وہ عمل افعال خداوندی کی مماثلت یا صنعت و حرفت اور تمدنی ایجادات کی ترقی نہیں بلکہ دینی فکر و تدبیر کی ترقی ہے۔ گویا تدبیر فی الآیات سے معرفت حقائق اور عرفان الہی تک پہنچنا جو افعال قلوب اور مساعی روح کی ترقی ہے۔ اور پھر ان عرفانی عقیدوں کے تقاضے سے افعال عبودیت کی ادائیگی اور عام بدنی عبادات کا بروئے کار لایا جانا ہے۔ جو درحقیقت ان عقائد کے آثار اور ثمرات کی ترقی ہے۔

ہاں مگر ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ معرفت عقائد میں استقامت اور قوت عملیہ کی راستبازی جس میں کجی اور کج فہمی کا شائبہ نہ ہو بغیر ذہن کی سلاحتی اور بلا ذہنیت کی استقامت کے ناممکن ہے۔ اور ذہنیت میں سے زلیغ

اور کجی کا نکل جانا عادتاً بلا تربیت و تعلیم ناممکن ہے۔ پھر اس صحیح معرفت اور علمی قوت کی واقعی راستی کے بعد بھی عادتاً عمل کا نقشہ اس وقت تک صحیح اور انداز مطلوب پر نہیں آسکتا جب تک کہ کسی عارف کا کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو تاکہ اسے دیکھ دیکھ کر اور اس پر تطبیق دے دے کر عمل و عبادت کے وہی نقشہ بنتے رہیں جو مطلوب ہیں بالخصوص جبکہ یہ عمل خدا تک پہنچنے اور اس کے قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہو تو وہ اس وقت تک کبھی بھی مطلوب نہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک کہ عمل کا کوئی خدائی ہی نمونہ سامنے نہ ہو جس کی زبان طرز اور لہجہ اور اشارات وغیرہ سے تو ہم خدا کے قانون اور اس کی عملی مرادوں کو سمجھ سکیں۔ اور جس کے عملی نمونوں کی محسوس ہدایتوں کو ذہن میں جا کر ہم اسی انداز سے عمل پیرا ہو سکیں۔ اور اس طرح ہمارا علم تو صحیح ہو کہ علم نافع بن جائے اور عمل مقبول ہو کہ عمل صالح ہو جائے جو منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے قرآن اتارا کہ اس کے تمام علمی و عملی گوشوں کو نمایاں کرنے اور فہم و عمل کے قابل بنانے کے لئے ذات باریکات محمدی کو حسی اور عملی نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ آپ کے خالص اور قطعی علم بالقرآن سے ہم علم سیکھیں اور آپ کے مقبول اور مصدقہ الہی عمل بالقرآن سے ہم عبادت و عادت اور معاشرت و سیاست وغیرہ کے عمل کی مطلوبہ صورتیں قائم کر سکیں۔ اور آپ کے تخلیق باخلاق اللہ سے ہم اپنے تو اسے عمل یعنی اخلاق صحیح کر لیں۔ اس لئے عملی

قرآن حقیقتاً ذاتِ محمدی ثابت ہوتی ہے جس نے قرآنی علوم کے مطابق عملی نمونے قائم کر کے دکھلائے نہ کہ یہ کائنات حسی کہ وہ اگر عمل ہے تو خدا کا ہے۔ نہ کہ بندوں کا مطلوبہ عمل۔ اور خدا کا عمل یقیناً عبادت نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ بندوں سے عمل بالقرآن کی صورت میں عبادت مطلوب ہے جو نبص قرآن تخلیق انسانی یعنی عالم خلق کی بھی حقیقی غایت ہے۔

اور میں نے جن وانس کو دراصل) اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ

إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

اور عالم امر وہی کی بھی واحد غرض و غایت یہی ہے کہ

وَمَا أَمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ

فَخَلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ

کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کیلئے

وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيَكُونُوا زَكَاةً

خاص رکھیں۔ یکسو ہو کہ نماز کی پابندی

وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ

رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں۔ یہی طریقہ ہے

ان درست مضامین کا۔

(پارہ عم سورہ بئینہ)

اور خود یہ عالم خلق یعنی کائنات اور اس کے عناصر و مواید نیز اس کے

افعال و خواص سو وہ محض مثال اور دلیل کے طور پر سامنے لائی گئی ہے نہ کہ

نمونہ عمل بنا کر۔ اگر یہ کائنات کا صنفی عمل ہی قرآن کا طلب کردہ عمل ہو تو معروضہ

سابق کے مطابق جبکہ اخباری آیات کے تحت ہر مخاطب پر ایک کائنات بنانا

اور انشائی آیات کے تحت ایک قرآن بنانا بھماثلت خداوندی ضروری ہوگا۔
تو حاصل یہ نکلے گا کہ انسان اس عالم میں بندگی کرنے نہیں آیا۔ بلکہ خدائی
کرنے کے لئے آیا ہے۔ حالانکہ اس بدیہی البطلان نظریہ کار و قرآن کی آیات ^{بالا}
اور عقل سلیم نیز بحیثیت مجموعی پورا دین صاف طور پر کر رہا ہے جس کی مسلمان
میں کوئی کھپت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے اس کائنات کے قرآنی عمل ہونے
کا دعویٰ ثابت نہ ہوگا۔ بلکہ واضح ہوگا کہ قرآنی عمل حبیب کہ عبادت اور بندگی
ہے تو اس امت کے لئے عبد کامل۔ اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا
دوسرا نہیں بندہ ہی اس قرآنی عمل کا نمونہ ہو سکتا ہے نہ کہ جبال و بحار اور خان
و بحار پس اگر برق صاحب کی طرح تعداد قرآن کا دعویٰ ہی کچھ قرآن کی منقبت ^{عظیمہ}
ہے تو وہ یوں ہونا چاہیے تھا کہ اس عالم موجودات میں ایک یا دو ہی قرآن
جلوے کر نہیں ہوئے جیسا کہ برق صاحب کا دعویٰ ہے بلکہ تین قرآن لائے گئے
ہیں۔ ایک یہ کتابی قرآن جو مجموعہ احکام ہے۔ ایک یہ کائناتی قرآن جو مجموعہ شواہد
و دلائل ہے۔ اور ایک یہ نفسی قرآن یعنی ذات نبوی جو مجموعہ اخلاق و اعمال ہے
پس کتاب اللہ یعنی اوراق مرقوم کو تعلیمی قرآن کہنا چاہیے۔ اور اس خلق اللہ
یعنی کائنات کو تمثیلی قرآن کہنا چاہیے اور رسول اللہ یعنی ذات محمدی کو تعمیلی
قرآن کہنا چاہیے۔ پس جو کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لے گا وہ علم و ہدایت سے
محروم رہ جائے گا۔ جو کائنات خلق میں تفکر سے آنکھ بند کر لے گا وہ شہودی

دلائل سے محروم رہ جائے گا۔ اور جو اسوۂ رسولؐ سے صرف نظر کرے گا وہ عمل
بالقرآن سے محروم رہ جائے گا۔

بہر حال سماوات و ارض کے عجائبات کی طرف متوجہ کرنے اور انہیں
غور و فکر کا امر کرنے کا مقصد قرآنی ہدایات کی روشنی میں معرفت خالق،
معرفت توحید ذات و صفات اور معرفت توحید افعال سے نفس انسانی کی
تکمیل۔ اور اسے فضائل علم و اخلاق سے آراستہ اور مہذب بنانا ہے۔
ریل و تار، ٹھون و لاسکی، موٹر اور جہاز وغیرہ کے کارخانے کھلوانا نہیں یعنی
موجد اور عابد بنانا ہے۔ انجینئر، لوہار اور بڑے پٹھسی بنانا نہیں کہ یہ سب کچھ بنانا
قرآن پر موقوف ہے۔ نہ ختم نبوت کی لائی ہوئی معرفت و بصیرت پر۔
البتہ بطور وسیلہ عبادت ان مادی اشیاء اور تمدنی صنائع سے کلیتہً
انگ کہ دیا جانا بھی مقصود نہیں بلکہ بضرورت عبادت اور بضرورت نفاذ
خلافت بقدر ضرورت ان وسائل کی تحصیل بھی ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ
معاشر کی طرف سے مطمئن ہو کر ایک انسان معاد کی فکر کر سکے۔ اور قانون
الہی کو قوت سے دنیا میں پھیلانے اور رواج دینے میں اس کے لئے
کوئی مانع یا حیلہ باقی نہ رہے۔ بالفاظ دیگر وہ اسباب معاش سے
تو اپنے نفس کا مقابلہ کر سکے جو راہ دین میں سب سے بڑا دشمن اور مانع ہے۔
اور وسائل قوت و شوکت سے فتنہ پردازوں کا مقابلہ کر سکے جو راہ شوکت

دین میں سب سے بڑے خارج اور بائع ہیں۔ اور اس طرح اعداد انفسی اور اعداد آفاقی کی دست برد سے دین اور شوکتِ دین محفوظ رہے پس یہ مادی وسائل اور تمدنی ایجادات برقی و بخاری، ریل و تار، گن اور کم، موٹر اور جہاز یا زمانہ کے حسب حال اور اسباب نقل و حمل اور اسباب علم و خبر جس کسی دور میں بھی چل پڑیں گے اور ان پر حیاتِ دنیا موقوف ٹھہر جائے گی تو اسلام بھی انہیں لامحالہ اختیار کرنے سے نہیں روکے گا لیکن نہ وہ ان کی ایجاد و تخلیق کو مقصدِ زندگی بنائے گا۔ نہ ان کی تخلیق و ایجادیں بالاصالت وقت صرف کرنا ضروری سمجھے گا۔ اور چل پڑیں گے تو بطور وسیلہ انہیں قبول کرے گا۔ لیکن جب بھی اس کی اخلاقی قوتیں بروئے کار آجائیں گی۔ تو وہ ان مصنوعی قوتوں سے اس کے لئے جگہ خالی کرالے گا۔

پس اسلامی نقطہ نظر سے نہ تو نظری طور پر ان وسائل کو مقاصدِ باور کرنا ہی جائز رکھا گیا ہے اور نہ عملی طور پر ان میں بے تک مقاصدِ غرق اور مستہلک ہو جانا ہی روا رکھا گیا ہے۔

اس نوعیت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ حیرت نہ ہونی چاہیے کہ مقاصدِ عبودیت کو چھوڑ کر صرف ان فانی وسائل میں کھپ جانے اور انہیں ہی مقصدِ زندگی ٹھہرائیے کو خلافتِ الہی کہا جائے۔ کوئی بھی سنجیدہ عقل اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ جس خلافتِ الہی کے برپا کرنے کے لئے

ہزار ہا انبیاء مبعوث ہوئے۔ لاکھوں حواری اور صحابہ انبیاء پر پائے گئے اور
 کروڑوں نائبان انبیاء اور صلحاء ظاہر ہوئے اس خلافت کے معنی لوہے۔
 پتیل، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مختلف معاشی سامان ڈھالنے اور ان سامانوں
 سے اسباب عیش و نشاط یا اسباب تباہی و ہلاک افرامہ کے ساتھ جیسا
 کہ کے دنیا میں فساد مچانے کے ہیں۔ اگر یہی خلافت الہی تھی تو ایک طرف تو
 معاذ اللہ فرعون، مہر، کسرا کے فارس، قیصر روم، خاقان چین، راجائے ہند
 نیز دوسرے اور بڑے بڑے عیش پسند یا جنگ جو سرما یہ دار بلکہ تمام دشمنان
 انبیاء جیسے قارون اور ہامان، نمرود اور شداد، بلوہیل اور ابو لہب وغیرہ
 سب سے بڑے خلفائے الہی ثابت ہوتے ہیں۔ اور یا پھر بڑے بڑے
 صنایع کو ہار، بڑھئی، صرف اور سنار وغیرہ خلفائے الہی ثابت ہوں گے۔
 اور جبکہ ان فنون اور فن کاروں کے وجود کے لئے قرآن اور نبوت ہی کی
 ضرورت نہ تھی تو دوسرے لفظوں میں اس خلافت کے لئے بھی نہ نبوت کی
 ضرورت رہتی ہے نہ قرآن کی۔ بلکہ اس خلافت کے حق میں نبوت خارج نکلتی ہے۔
 اس لئے کوئی نبی بھی اس برقی اصول پر خلیفہ الہی باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ کوئی بھی
 ایسا شخص جو ان مادیات کے عشق سے کٹ کر یاد خداوندی میں راسخ القدم
 ہو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتا ہو یا آخرت کے راستہ سے دنیا پر تجاوز
 پانے کا جذبہ و عمل رکھتا ہو، خلافت کی فہرست میں شامل نہیں رہ سکتا۔

اختراع کر لئے گئے انہی کو مرادِ بانی سمجھ لیا گیا۔ اور دین کو نقلی رکھنے کے بجائے
 اختراعی قرار دے لیا گیا تاکہ اس کی تعبیرات کو باقی رکھ کر ازراہ تبلیغ اس کے
 معانی میں مانے تصرفات کے راستے کھلے رہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کو
 الفاظ قرآنی سنا کر بآسانی جاں میں پھانسا جاسکے۔

بہر حال جس خلافتِ الہی کے لفظ کو ہاتھ میں لے کر یہ تجارتی، صنعتی اور
 تمدنی ترقی اس کے مفہوم میں شامل کی گئی بلکہ انتہاء اسی کو اس کا صحیح مفہوم قرار
 دیدیا گیا۔ اس کی حقیقت بھی طرح واضح کر دی گئی۔ تاہم پھر بھی اس کی ضرورت
 باقی رہ جاتی ہے کہ بحث و تنقید سے الگ ہو کر تحقیق کی نگاہ سے بھی اس سلسلہ
 کو دیکھا جائے اور یہ تبلا یا جائے کہ اگر خلافت اور ایمانداری کے وہ معنی نہیں اور
 یقیناً نہیں جن کو برق صاحب نے اختیار کیا ہے تو اس کے اصلی معنی کیا ہیں؟
 اور اگر یہ تمدنی ایجادات اور مادہ کو توڑ پھوڑ کر مختلف اشیاء بنانا یا عناصر
 کائنات کو مسخر کرنا یا ہوا و ارض میں اڑنا اور ایجاد و اختراع سے مادی دنیا کو قابو
 میں لے آنا خلافتِ الہی نہیں تو کیا پھر خلافت کے معنی بقول برق صاحب
 کے ایسی کوری ملائیت کے نہیں رہ جاتے جس کے نیچے بقول موصوف مشائخ
 قدرت سے ناواقفی، انفسی اور آفاقی وسائل سے بے خبری اور انجام کار
 بے بسی اور بے حسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے؟ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ
 خلافتِ الہی کی نوعیت پر ایسے انداز سے روشنی ڈالی جائے کہ جس کے

اُجالیے میں تسخیر کارنامات کی وہ نوعیت بھی واضح ہو جائے جو قرآن نے انسان سے طلب کی ہے۔ اور جو خلافت کا حقیقی مفہوم ہے۔ نیز عبادت و بندگی یا دیانت کے فرائض کا رشتہ بھی اس تسخیر عالم سے واضح ہو جائے جو اسان خلافت کی حیثیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی جن تین قرآنوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ان کی عرض کردہ موضوع۔ اور مقصد کی نوعیت بھی تحقیقی رنگ میں کھل جائے۔

قرآن کا مقصد و حیدر تکمیل خلافت کے

سو حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کا مقصد و حیدر انسان کو اس کی حد کمال پر پہنچا کر اس کی انسانیت کی تکمیل کرنا ہے اور جبکہ کمال کا حقیقی سرچشمہ ذاتِ خداوندی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا جس کے اوصاف و افعال سے اسی کے فرمان کے مطابق مشابہت پیدا کر کے ان کمالات کو بقدر استعداد و قابلیت جو ہر نفس بنا لینا ہی انسانیت کی تکمیل ہے اور اس تشبیہ استکمال ہی سے خدا کی نیابت و خلافت کا استحقاق خصوصی طور پر انسان کے لئے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے تکمیل انسانیت کا دوسرا نام تکمیل خلافت نکل آتا ہے۔ اور قرآن حکیم کا حقیقی مقصد انسان کو خلیفہ ربانی کر دیکھانا ٹھہر جاتا ہے۔

معیار خلافت و استخلاف

ظاہر ہے کہ کوئی بھی کسی کا خلیفہ یا نائب اور قائم مقام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ فیصلہ اور اصل کے اوصاف کو اپنے اندر سمونہ لے۔ اور ان سے متاثر ہو کر اصل کا نمونہ نہ بن جائے۔ ایک عالم کا خلیفہ عالم ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ جاہل۔ ایک عارف باللہ اور روشن ضمیر و روش کا خلیفہ عارف ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ تنگ سینہ اور کیو ریاطن۔ ایک با اقتدار بادشاہ کا قائم مقام یا اقتدار ہی بن سکتا ہے نہ کہ گدائے بے نوا، اور عاجز و در ماندہ۔ ایک پہلوان کا خلیفہ پہلوان ہی ہو گا۔ نہ کہ پہلوانی کے واوپیچ سے نابلد، ایک شاعر کا قائم مقام شاعر ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ فن شاعری سے ناواقف اور کج مچ زبان۔ اس لئے خدائے برتر و توانا کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو خدائی اوصاف و کمالات کے پر تو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔ ان سے متاثر ہو، ان کا سچا نمونہ بن کر پودہ دنیا پر نمودار ہو۔ اور پوری پوری طرح اس کا اطاعت شعار ہو کر اس کی مرضیات پر عمل پیرا ہو۔ نہ وہ کہ جو اس کے اوصاف و کمالات سے قطعاً نا آشنا یا ان کی نسبت نااہل اور یا ان اوصاف و افعال کی مخالف سمت میں جا رہا ہو۔ اور اسے اطاعت و انقیاد سے کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ ہر آن بغاوت پر تلا ہو رہا ہو۔

کمالاتِ خداوندی کی نوعیں

ہاں مگر اللہ جل ذکرہ کے وہ لامحدود کمالات جن کے اقتباس سے آدمی خلیقۃ
الہی قرار پاتا ہے۔ اصولی نقطہ نظر سے تین نوعوں میں منحصر نظر آتے ہیں۔ کمالات
علم و ادراک۔ کمالات وصف و اخلاق اور کمالات صنعت و افعال چنانچہ
کتاب و سنت میں جس قدر بھی اسماء و صفات اسم یا فعل کی صورت میں ذکر فرمائے
گئے ہیں وہ سب انہی تین انواع کمالات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یا وہ علمی اسماء
ہیں۔ جن سے اللہ کے علمی کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔ جیسے علیم و خبیر۔ سمیع و
بصیر، مدبر و واحد۔ وغیرہ یا وہ اخلاقی اسماء ہیں جن سے اس کے جوہری اخلاق
اور پاکیزہ و لطیف قہائے باطن پر روشنی پڑتی ہے جیسے عبور و شکور، رؤف و
غفور، رحیم و کریم۔ عفو و حلیم اور قوی و متین وغیرہ یا افعال اور صناعتی اسماء ہیں جن
سے اس کے صنعتی کمالات پر روشنی پڑتی ہے جیسے خالق و باری۔ مدبّر و
مصور۔ مبدی و معید۔ محی و ممیت، نافع و ضار۔ اور رازق و معطی وغیرہ البتہ
اسما سب کے سب یا انہی تین کے متعلقات۔ اور مبادی و آثار میں سے ہیں یا نفس
ذات کے پورہ دار ہیں۔

قرآن کریم نے اصولی اور کلی طور پر ان تینوں کمالات کا حقیقی سرچشمہ حق

تعالیٰ کو بتلائے ہوئے سارے جہانوں پر اس کے انہی تین کمالات کا احاطہ عام ثابت فرمایا ہے۔ کمالات علم و ادراک کے احاطہ عام کے بارہ میں ارشاد ہے۔

وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عِلْمًا

اور بیشک خدا تعالیٰ از روئے علم
کے ہر شے کو محیط ہے۔

کمالات و صفت اخلاق کی اصل صفت رحمت جو جمالی اخلاق کا سرچشمہ اور جلالی اخلاق کا سرمنشا ہے۔ اور جس کی ہمہ گیری گویا تمام اخلاق کمال کی ہمہ گیری ہے اس کے احاطہ عام کے بارہ میں فرمایا۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ

اور میری رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔

کمالات صنعت و افعال کے احاطہ عام کے بارہ میں فرمایا۔

صُمِّعَ اللَّهُ الَّذِي أَنْشَأَ كُلَّ
شَيْءٍ

یہ خدا کا کام ہو گا جس نے ہر چیز کو ^{سب} دنیا انداز
پر مضبوط بنا رکھا ہے۔

غرض کمالات ربانی کی بھی تین اصولی انواع ہیں جو تمام برکات و میرات کا سرچشمہ ہیں اس لئے قدرتی بات ہے کہ انسان اللہ کا نائب یا خلیفہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان سب گانہ کمالات میں اسی کے طرز کمال کا نمونہ بن کر نہ دکھلائے۔ اور ان کمالات علم و ادراک، کمالات و صفت و اخلاق اور کمالات صنع و افعال کی روشنی اپنے اندر جذب کر کے اسی انداز سے نہ پھیلائے جو انداز افادہ خود اس خداوند ذوالجلال والا کرام کا ہے۔

بعثت انبیاء کا مقصد انہی کمالات سے گانہ کی ترویج و تکمیل ہے

چونکہ انبیاء علیہم السلام اولین خلفائے الہی ہیں۔ اس لئے ان کی بعثت کی غرض و
غایت ان ہی تین کمالات علم و خلق و صنع سے نبی آدم کو آشنا بنانا اور عملی طور پر اس راہ
چلانا ہے تاکہ انسان خلیفہ الہی بن کر اپنے منیب کے مشاکے مطابق انہی تینوں کمالات
کی روشنی میں اس کمالات کا انتظام کرے اور مالک کمالات کی مرضی پر خود چل کر
اس کی رعایا کو چلائے۔

اسی لئے سرور انبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض و
غایت انہی تین کمالات کی ترویج و اشاعت ظاہر فرمائی۔ چنانچہ علمی کمالات کی
ترویج کا غرض بعثت ہونا تو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ

انما بعثت معلماً
میں بھیجا گیا ہوں معلم بنا کر۔

اخلاقی کمالات کی ترویج کا غرض بعثت ہونا ان الفاظ میں ظاہر فرمایا

سبعثت لانتہدکم عن الأفعال
میں بھیجا ہوں اس لئے گیا ہوں کہ اعلیٰ ترین

اخلاق کی تکمیل کروں

عملی اور صنعتی کمالات کے غرض بعثت ہونے کے اعلان کے لئے شریعتِ عرفیہ
کی ترویج کو غرض بعثت ظاہر فرمایا (جو ہر نوع کی حکمتِ عملی یعنی تہذیبی، تمدنی، مدنی
عمرانی، تمدنی، اقتصادی، سیاسی اور صنعتی وغیرہ افعال کے فطری اصول پر مشتمل
ہے) اور جس کے مجموعہ کا نام شریعت ہے۔ فرمایا

بُعِثْتُ بِالْحَقِيقَةِ السَّحْلَةِ

میں بھیجا گیا ہوں سیدھی، سہل، روشن اور

السَّحْلَةِ الْبَيْضَاءِ

رعایتوں پر مشتمل شریعت دے کر

قرآن حکیم نے ان تینوں مقاصد بعثت کو ایک مختصر آیت میں اعجازی جامعیت کے
ساتھ جمع فرما کر اعلان فرمایا کہ

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ

وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں

رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ

ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں) ایک پیغمبر

آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

سناتے ہیں۔ اور ان کو (عقائدِ باطلہ و خلاق

ذہمہ) پاک کرتے ہیں۔ اور ان کو کتاب اور

دانشِ مندی کی باتیں سکھلاتے ہیں۔

اس آیت میں بعثت کی ایک غرض تلاوت و تعلیم آیاتِ تنلانی گئی جو کمالات

علم کی تکمیل ہے۔ بعثت کی دوسری غرض تزکیہ نفوس ظاہر فرمائی گئی جو کمالات

اخلاق کی تکمیل ہے۔ بعثت کی تیسری غرض تعلیمِ حکمت فرمائی گئی جو اسوۂ حسنہ

یعنی حکمتِ عملی کے ذریعہ کمالاتِ عمل کی تکمیل ہے (کیونکہ حکمت کے معنی حسب تفسیر
 عیسیٰ علیہ السلام علم نافع اور عمل صالح کے ہیں جیسا کہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے۔ اور
 علم نافع جبکہ تلاوت آیات میں آگیا تو آگے عمل صالح ہی حکمت کے مفہوم میں
 باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے حکمت کی تفسیر عملی تکمیل ہی سے کی ہے
 پس یہ آیت اس طرح تین حکمتوں حکمتِ عملی، حکمتِ علمی، حکمتِ اخلاقی پر مشتمل نکلی
 جس سے واضح ہو گیا کہ آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ تمام انبیاء کے دنیا میں
 بھیجے جانے کی غرض و غایت انہی تین حکمتوں اور کمالوں کی علمی تشریح، اخلاقی تنظیم
 اور عملی تکمیل ہے جو اس اس خلافت ہیں۔



کمالات سرگازہ کی نوعیت

ہاں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ بسلسلہ منصب خلافت ان ہر سہ کمالات میں تشبہ بالخالق کی منزلیں طے کرنے کے لئے ان کمالات الہیہ کی وہی نوعیت اختیار کرنی پڑے گی جو خود اس سرچشمہ کمالات کے یہاں ان کی فطری نوعیت ہے تاکہ اسی نوعیت کا علم و خلاق اور صنع و عمل ہم پہنچ کر حقیقی معنی میں خلافت کا ثبوت فراہم ہو جائے۔ اور اس کی ضرورت نہ پڑے کہ خلافت کا شرعی لفظ اختیار کر کے اس میں معنی اپنی طرف سے ڈالے جائیں۔ اور حقیقی کے بجائے مصنوعی خلافت رہ جائے جس کی حقیقت تلبیس کے سوا کچھ نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ان ہر سہ کمالات الہیہ کی وہ اولین اصولی نوعیت جو ان میں بطور قدر مشترک کے یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

”غبار کامل“ ہے جس میں محتاجی غیر کا ادنیٰ شائبہ تک نہیں۔

چنانچہ علم الہی کی پہلی اور آخری شان یہ ہے کہ وہ وسائل اور وسائط کا محتاج نہیں۔ وہ کسی نہیں خود اپنا ہے۔ وہ استدلالی نہیں ذاتی ہے کہ ماضی و مستقبل اور شاہد و غائب سب اس کے سامنے بطور علم ضروری کے خود بخود حاضر ہیں اسے حصول علم کے لئے استدلال کی حاجت نہیں کہ وہ قیاسات سے معلومات کے اندازے لگائے۔ کہ یہ جہل کی علامت ہے اور وہ جہل سے بری

بالا ہے۔ اسے ظن و تخمین سے نتائج تک پہنچنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لاعلمی کا عیب ہے۔ اور وہ ہر عیب سے مترہ اور مقدس ہے۔ اسے کتابوں سے پڑھ کر اور استادوں سے سیکھ کر معلومات حاصل کرنے کی حاجت نہیں کہ یہ ذات کمالات سے خلوا اور استکمال یا غیرے جو سراسر محتاجگی غیر ہے۔ اور وہ خلوا اور احتیاج سے بری ہے۔ اسے حقائق تک پہنچنے کے لئے صورتوں اشکال اور محسوس ہیئتوں کی حاجت نہیں کہ یہ علم بالواسطہ ہے۔ اور وہ وسائط کی محتاجگی سے بری ہے عرض علم کے دائرہ میں پہلی چیز وہاں اسباب علم سے غنار مطلق ہے۔ اسی لئے علم کے مبادی ہوں یا نتائج ہیئت ہو یا حقیقت صورت ہو یا ماہیت سب وہاں بیک دم حاضر ہیں۔ نہ ان کے اول میں غیر کی محتاجگی ہے۔ نہ آخر میں، نہ ظاہر میں نہ باطن میں کہ وہ خود ہی ہر چیز کا اول ہے۔ اور خود ہی آخر، خود ہی ظاہر ہے اور خود ہی باطن۔

هُوَ الْاَوَّلُ الَّذِي قَبْلَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الْاٰخِرُ الَّذِي بَعْدَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الظَّاهِرُ الَّذِي فَوْقَهُ شَيْءٌ وَهُوَ الْبَاطِنُ الَّذِي دُونَهُ شَيْءٌ

اس لئے علم الہی کی اساس غنار مطلق ٹھہر جاتی ہے۔

نظر میں علم کے دائرہ میں اللہ کے حقیقی خلفار وہی ہو سکتے ہیں جن کے علم کی شان یہ غنار کامل ہو کہ وہ یا تو بلا کسب و اکتساب اور بلا واسطہ کتاب استاد نیز بلا ریاضت و مجاہدہ دہی اور الہامی طور پر براہ راست اللہ سے اس کا علم پائیں جس کا نام علم لدنی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہے۔ اور یا پھر

کسب و ریاضت بھی اگر ہو تو انبیاء ہی کے تعلیم کردہ اصول و طرق اور انہی کے پیش کردہ اسوہ کے مطابق ہوجن پر چل کر یہ علم کو آغاز کار میں کسی اور اصولی کہلائے مگر آخر کار علم الہی سے ایک نسبت پیدا کر کے دہی بن جائے اور خود قلب صافی ہی میں سے علم کا چشمہ پھوٹ نکلے جس میں وہی شان غنار آ جائے کہ نہ اس میں رسمی و سائلط کی احتیاج باقی رہے نہ کتاب و استاد اور دوسرے مسائل تعلیم کی حاجت رہے جو اولیائے امت ائمہ ملت اور صلحائے قوم کی شان ہے۔

یعنی اندر خود علوم انبیا

بے کتاب و بے معیار و اوستا

ہاں پھر علم ہی کی طرح یہی صورت اخلاق ربانی کی بھی ہے کہ ان کا شہنا بھی درحقیقت یہی غنار کامل ہے جو اس اخلاقی خلافت کی اساس ہے۔ یعنی ہر خلق حسن کی روح آئینہ میں یہی غنار اور عدم احتیاج نکلتی ہے جیسا کہ ہر بد خلقی کی روح انجام کار محتاجگی اور عجز کی غلامی اور اسیری نکلتی ہے مثلاً تو اضع لہ کے معنی یہی یہ ہیں کہ ہم رسمی جاہ اور خودی سے کنارہ کش اور بے نیاز ہیں۔ سخاوت و قناعت کے معنی یہی یہ ہیں کہ ہم مال و منال کی محبت و طلب سے آزاد اور بے پرواہ ہیں۔ صبر کے معنی یہی یہ ہیں کہ ہمیں فوت شدہ کا غم نہیں یعنی ہمیں اس کی احتیاج نہیں۔ شکر کے معنی یہی یہ ہیں کہ ہم اس نعمت سے

اٹکے ہوئے نہیں بلکہ منعم سے وابستہ ہیں جو ہنر چہنمہ غنار ہے شجاعت کے
 معنی ہی جان سے بے نیازی اور استغناء کے ہیں جیسا کہ معنی ہی حق کی خاطر
 مرغوبات نفس سے بے پرواہ ہو جانے کے ہیں۔ ایشارہ کے معنی ہی دوسرے
 کے نفع کی خاطر اپنے منافع سے دست بردار اور بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔
 حلم کے معنی ہی انتقام سے بے نیازی اور جذبات انتقام سے بالاتر ہو جانے
 کے ہیں۔ عفو و درگزر کے معنی ہی حق کی خاطر سزا و تعزیر سے بے نیازی رہنے کے
 ہیں۔ غرض ہر خلق حسن کی روح آخر میں غنا اور غیر محتاجگی نکلتی ہے۔ کہیں اپنے سے
 کہیں دوسرے سے۔ کہیں اپنے حقوق سے کہیں دوسرے کے حقوق پر دست
 سے۔ اور اس کے بالمقابل اخلاق حسنہ کی اضداد یعنی ہر بد خلقی کی بنیاد و جلی
 طور پر محتاجگی اور غیر کی اسیری نکلتی ہے۔ مثلاً تواضع کے مقابلہ میں تعلی
 کے معنی غیر پر اپنا تفوق جتانے کے ہیں جو سر اسر غیر کی محتاجگی ہے۔ کیونکہ
 غیر نہ ہو تو تفوق کس پر جتایا جائے؟ لہذا غیر کی محتاجگی ہوئی پھر وہ ہمیں اپنے
 سے خالق خیال نہ کرے تو یہ تعلی کا میاب کیسے ہو؟ لہذا غیر کے خیال تک کی
 محتاجگی ہوئی۔ اس لئے تعلی اور شیخی سے تاپا احتیاج بخیر نکلتی ہے جو ہمیں دوسرے
 کا اسیر اور قیدی بنا دیتی ہے جسے ہم غلط فہمی سے عزت تصور کرنے لگتے
 ہیں۔ حالانکہ وہ انتہائی دولت اور دولتوں کی جڑ بنیاد ہے۔ یا مثلاً سخاوت
 کے مقابلہ میں بخل کے معنی مالی محتاجگی کے ہیں نہ کہ اس سے عتی اور آزاد ہو جانے

کے۔ بے صبری اور بجزع فزع کے معنی فوت شدہ سے اٹکاؤ اور اس کے
 غم میں گھل جانے کے ہیں کہ اس کے بغیر چین و قرار نہیں۔ اگر اس سے
 غنی ہوتے تو یہ بے چینی کیوں ہوتی۔ یہی اس کی محتاجگی اور غلامی ہے۔ چین و
 بزولی کے معنی مقابل کی صورت سے متاثر ہو کر اس کی طاقت سے دب جانے
 کے ہیں اور تاثر ہی محتاجگی ہے۔ ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی ہر چشمہ
 نعمت یعنی منعم سے کٹ کر خود اپنے بے نعمت نفس کی اسیری اور غلامی کے
 ہیں جو خود بذاتہ اس نعمت سے محروم تھا ورنہ دوسرے سے نعمت کا خواہاں اور
 حاصل کنندہ کیوں ہوتا اور محرومی و مفلسی یا عطارِ غیر کی احتیاج ہی غیر کی اسیری
 ہے جو ہر تاسر ذلت نفس ہے۔ حرص کے معنی دولت اور اسبابِ شہوت
 کی محتاجگی کے ہیں۔ بے حیائی اور فحش کے معنی عقل و شرع سے الگ ہو کر خواہش
 نفس کی پیروی کے ہیں۔ جو باطبع جاہل اور بے تمیز ہے گویا ہر چشمہ جہالت
 کی محتاجگی اور اسیری کے ہیں جو ذلیل قسم کی ذلت ہے۔ عرض ہر بد خلقی
 محتاجگی غیر اور ذلت کی جڑ ہے۔ اور ہر نیک خلقی عنارِ نفس، عزت و خودی
 اور وقار و خودی کی اساس ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہ کی
 ذات یا برکات تمام اخلاقِ حسنہ کا سرچشمہ اور معدن ہے تو عنارِ مطلق
 اور وحدیت کا سرچشمہ بھی وہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا یہ عنار بھی اس کی ذات
 لا محدود کی طرح لا محدود ہی ہوگا۔ یعنی یہ بے نیازی سارے جہانوں اور جہانوں

کی ایک ایک چیز سے ہوگی کائنات اور کائنات کے سارے وسائل سے
ہوگی اسی لئے اس نے اپنی شان خود ہی ارشاد فرمائی ہے

وَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ط اور بلاشبہ اللہ سارے جہانوں سے

بے پرواہ ہے -

یعنی وہ کسی چیز سے اٹکا ہوا نہیں۔ اسی لئے اس کی عزت اور اس کا اقتدار

بھی جہانوں کے ذرہ ذرہ پر چھایا ہوا ہے اور اسی لئے اس نے اپنا

نام صمد بتایا ہے جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب

اس کے محتاج ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھ لینا کچھ مشکل

نہیں کہ اخلاق کے سلسلہ میں اللہ کا نائب اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے۔ جو

ان اخلاق الہیہ صبر، شکر، جود و کرم، رافت و رحمت، محبت حق، قوت و

توانت وغیرہ سے متخلق ہو کر سارے جہانوں اور جہانوں کی ایک ایک

چیز سے بے نیاز اور غنی بن جائے۔ اور بالفاظ مختصراً اپنے خالق کے غنار

کامل کا مظہر اتم بن کر اسے اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کی احتیاج باقی نہ رہے۔

بے نیازی، بے لوثی اور استغناء کلی اس کے چہرے ہرے اس کی ہر حرکت و

سکون، اور اس کے اقوال و افعال سے نمایاں ہو۔ اور اس غنار کامل سے

اس کا باطن اور اندرون مگن، مطمئن، منشرح اور آسودہ ہو کر ہر غیر سے آزاد

ہو جائے۔ نہ اس کی عزت و جہا کسی کے خیال پر موقوف ہو نہ اس کا ^{نفس} ~~خود~~ ^{نفس}

غناہ کامل اور غیر محتاجی غیر ہے۔ یعنی اللہ کا کوئی فعل اور اس کی کوئی صفت نہ وسائل کی محتاج ہے نہ اسباب کے تابع ہے وہ خود ہی مسبب الاسباب ہے۔ اور خود ہی مستول الوسائل ہے۔ تمام افعال کو اسی کی باطنی قوت نمایاں کرتی ہے جس میں نہ مادہ درکار ہوتا ہے نہ مدت۔ خود اسی کی باطنی طاقت ایک فعل کو ذہنی وجود دے کر اسے بیک دم خارج میں نمایاں کرتی ہے جس کے لئے یہ اسباب و مسببات کا سلسلہ ضروری نہیں بلکہ صرف کن فیکون کی لا محدود طاقت سے یہ افعال بروئے کار آتے ہیں۔ اور اگر اس ظاہری عالم میں اس کے افعال بذیل اسباب بھی نمایاں ہوتے ہیں تو خود اسباب کا وجود بھی فوری اور اور آتی طور پر اسی کن فیکون کی قوت سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ غرض افعال خداوندی میں اسباب و مسببات کا سلسلہ یا مادہ و مدت کا علاقہ یا زمان مکان کا رابطہ کسی محتاجی کے سبب سے نہیں بلکہ حکمت کے ماتحت ہے جو مخلوق کے ضعیف نفوس کی تسلی اور سہولت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اور اسی کی تخلیق و ایجاد سے ہے ورنہ قدرت مطلقہ کو ان سلسلوں کی قطعاً حاجت نہیں۔ اسی لئے خوارق عادت یعنی معجزات یا کرامات یا اہصات یا وقتی غیر معمولی حوادث کا باب قائم کیے اور ہر کلیہ میں مستثنیات رکھ کر نیز ہر دائرہ میں اختلاف و تضاد ڈال کر قدرت مطلقہ اور غیر محتاجی و وسائل کا کھلا عملی اعلان بھی فرما دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب صنائع خداوندی کی اصل شان و سائل سے غنا رہے اور اختیار و سائل محض حکمت و مصلحت کے لئے ہے اور وہ بھی ایجاد و سائل کے ساتھ نہ کہ محض استعمال و سائل کے ساتھ تو انسان کو کبھی حقیقی طور پر صنعتی خلافت اس وقت تک میسر نہیں آ سکتی جب تک کہ اس کے بھی صنع و عمل کی قوتیں اسباب و مسببات اور زمان و مکان کے سلسلوں سے بے نیاز ہو کر اسی کون فیکوینی کے انداز کی نہ ہو جائیں جیسی خود اس صنایع عالم کی ہیں نیز حقیقی معنی میں انسان اس وقت تک نائب صنعت و فعالی قرار نہیں پاسکتا جب تک کہ ان وسائل ظاہری سے اسے ایسا غنا میسر نہ آجائے کہ مادہ و مدت اس کے کاموں میں کوئی توقف پیدا نہ کر سکیں اور وہ اپنے صنع و عمل میں کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے خواہ یہ غیر وہ بے شعور وسائل ہوں یا یا شعور اشخاص و اعیان، عناصر و مواید ہوں یا خلکیات و ارضیات یہ تمام اشیاء نہ اس کی صنعت میں خارج ہو سکیں نہ اس کی کسی صنعت کا موقوف علیہ بن سکیں۔ وہ چاہے تو بلا وسائل پر واز محض خدا کی طاقت کے بھروسہ اور اپنی قوت یقین سے اسمالوں تک پر واز کر سکے۔ وہ چاہے تو بلا وسائل رصد گاہ اپنے اثرات خلکیات تک پہنچا دے وہ چاہے تو بلا وسیلہ لاسلیکی اپنی صدا مشرق سے مغرب تک پہنچا دے۔ وہ چاہے تو فرش زمین پر بیٹھ کر فرش ہی کی نہیں فرش کی تیریں لئے آئے وغیرہ۔ عرض اس کی بہر

صنعت و کارکردگی خود اسی کی قوت متخیلہ اور قوت دھیان و تصور کے تابع ہو جائے کہ جو دھیان باندھ لے وہ واقعہ بن کر سامنے آجائے۔ گویا یہ خارجی عالم اس کا ایک خیال بن جائے کہ اس کی خیالی جنبش اجزائے عالم کو جنبش میں لے آئے۔ یعنی وہ اپنے کام میں باہر کا تابع نہ رہے بلکہ بہر بیرون اس کے اندرون کا تابع ہو جائے جس کا حاصل وہی کمال غنا رکھنا ہے جس سے نفس ہی اپنی معنوی قوت سے بڑے بڑے افعال بروئے کار لائے جن میں کسی مادی وسیلہ کی محتاجگی نہ رہے۔ یہ جدا بات ہے کہ ایسا قوی المعنویت بندہ اپنی شان عبدیت نمایاں رکھنے کے لئے اس غنا پر کام مظاہر نہ کرے۔ اور پیش حق باذن حق اپنی شان ادب قائم رکھنے کے لئے سعواص کی طرح اسباب و وسائل کا پابند بنا رہے۔ اور جب بھی اس قوت کو کام میں لائے تو بایمار حق استعمال کرے تاکہ اس غنا پر کے ساتھ بھی اللہ کے سامنے اس کی محتاجگی اور بندگی غیر مشتبه طور پر پیش ہوتی رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ صنعتی خلافت کا یہ اعلیٰ ترین مقام کہ صنعت و کسب میں اعتقاداً اور عملاً اسباب و وسائل کی حاجت باقی نہ رہے۔ اور صرف ادباً و اتباعاً ہی انہیں اختیار کیا جائے یقیناً کابلیں کا حصہ ہے۔ مگر اس خلافت کا وہ مقام جو ہر قابل خلافت مومن کے لئے ضروری ہے یہ ہے کہ اگر وہ عملاً اسباب و وسائل سے مستغنی نہیں تو کم از کم اعتقاداً ان کی محتاجگی کے دلدل سے نکلا

ہوا ہو یعنی اگر ہاتھ پیر اسباب سے بے نیاز نہ ہوں تو کم از کم دل ہی ہو اور اس میں یقین صاوتی موجب ان ہو کہ یہ اسباب و وسائل محض حیلے ہیں جو طفل تسلی کے طور پر ہمارے ضعیف البقین نفوس کے سہارے کے لئے رکھ دیتے گئے ہیں جن میں بذاتہ کوئی ادنیٰ تاثیر نہیں۔ مؤثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ثناء کی ذات باریکات ہے۔ پس ایسے خلفا میں اگر ترک اسباب سے صنعت گری کی قوت نہیں تو دل سے اعتقاد رکھنے کی قوت بہر حال موجود ہوتی ہے جو ان کے ظاہر کو نہیں تو کم از کم باطن کو ضرور مستغنی رکھتی ہے۔ اور اگر ظاہری خلافت ان کے حصہ میں نہ آئے تو باطنی خلافت ان کا نصیبہ بن جاتی ہے۔

البتہ الظاہر عنوان الباطن کے اصول پر ان کی عملی زندگی اس اعتقاد کا رنگ لئے بغیر نہیں رہتی اور وہ اسباب طبعیہ کی طرف اگر جھکتے بھی ہیں تو کسی شغف و انہماک کے ساتھ یا اس محتاجگی پر فخر و مباہات کے جذبات کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ اجماعاً فی الطلب و توکل علیہ کے رنگ سے فی الجملہ ہی اس عملی طلب اور اختیار اسباب پر متوجہ ہوتے ہیں۔ دل ان کا غنی رہتا ہے۔ البتہ ان کے اس مستغنیانہ عمل اور اعتقاد کی بدولت یہ وسائل و اسباب سے بے نیازی کا ذخیرہ نفس میں تدریجاً جمع ہوتا رہتا ہے اور آخرت میں ایک دم یکجا ہو کر بالآخر ان میں بھی وہی کن فیکونی کی شان پیدا کر دے گا۔ اور ان کی باطنی قوت غنا اس درجہ متخیلہ پر عادی ہو جاوے گی کہ وہ جو خیال باندھ لیں گے۔

علہ ظاہر باطن کا آئینہ ہے۔ عہد باریک جہت جس میں توکل کے ساتھ اسباب کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

وہی تشکل ہو کر سامنے آجائے گا۔ اور جو چاہیں گے وہ بلا تو سبب اسباب اچانک ہو جائے گا۔ پس یہ دنیا کی خلافت باطنی وہاں حقیقی خلافت بن جائے گی۔ اور
 و لکم فیہا ما تشتہی انفسکم و لکم فیہا ما قد عون کا کھلا ظہور ہو جائے گا۔
 بہر حال صنع و عمل میں اسباب مادی سے بے نیازی صناعتی خلافت کی

روح ہے خواہ اس کا مکمل ظہور عملی طور پر دنیا ہی میں ہو جائے جو شان ابلیس و
 اولیاء ہے یا اعتقاد کی قوت سے آخرت میں نمایاں ہو جبکہ صلحائے امت
 اس غنار قلبی کو بذریعہ اعتقاد جزو نفس بنالیں۔ پس جو نہی مکتوبات نفس کے کھلنے
 کا دن دیوم قیامت) آجائے گا۔ وول ہی مومن کی یہ اعتقاد ہی قوتیں عملی طور پر نمایاں
 ہو جائیں گی۔ اور اس کی خلافت کاملہ کا ظہور ہو جائے گا جو درحقیقت اسی مادی
 خلافت کا اوجہ اور بروز ہوگا۔

غرض صنعت و افعال میں خلافت الہی اسی وقت نصیب انسان ہو سکتی
 ہے جبکہ وہ وسائل مادیہ کا دیروزہ نہ رہے خواہ حالاً خواہ استدلالاً خواہ عملاً
 خواہ اعتقاداً بلکہ خود وسائل اس کے دیروزہ گر اور طالب بناوئے جائیں جو
 غنی عن العالمین کی شان ہے پس صنعتی خلافت کی اساس و بنیاد بھی وہی غنار اور
 ماسوی اللہ سے بے نیازی تکلی جو علم و اخلاق کی خلافت کی بنیاد تھی۔ اور واضح ہو گیا
 کہ وسائل سے غنی ہوئے بغیر یا انہیں غیر موثر بالذات یقین کئے بغیر اور پھر ان

علہ یعنی جنت میں جو نعم چاہو گے ملے گا۔

ہیں انہماک و شغف اور مبالغوں کو ترک کئے بغیر صنعت الہی کی خلافت میسر نہیں آسکتی۔ اور جب کہ خلافت کی روح ہی غنا و توکل ٹھہری تو جس درجہ کے غنا و توکل کی طاقت ہوگی اسی درجہ کی طاقت کی خلافت بھی ہوگی۔ خواہ وہ علمی خلا ہو یا اخلاقی اور ہمتا عتی ہو۔

مثلاً اگر حق تعالیٰ کے بارہ میں توت یقین و اعتماد عین الیقین کے مرتبہ پر ہونے کے سبب یہ غنا و توکل درجہ حال میں ہو جس کی جڑیں قلب و قالب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر مکہ را سخہ کی شکل اختیار کر چکی ہوں تو خلافت بھی حقیقی اور ظاہر و باطناً مستحکم ہوگی جس میں علم اور اخلاق و صنعت اسباب ظاہری سے کلیتہً بے نیاز ہوں گے۔ اور اختیار اسباب محض انثال امر اور محض آداب عبودیت کے لئے ہوگا۔ نہ کہ اختیار کی بنا پر کیونکہ وہاں جنود ملائکہ کی نصرت اور خود ان نفوس طیبہ کی و مدارصیت اذرصیت والی اعجازی قوت ساتھ ہوگی جس سے ان کی احتیاج صرف ذات حق سے وابستہ ہوگی کسی شیخ سے نہیں۔ یہ خلافت ابیاد و اولیاد کی ہے۔ اسی کے تحت غزوہ بدر میں ملائکہ سوہن ہزاروں کی تعداد میں آئے۔ تاکہ ان تلیل التعداد و مجاہدوں کے دلوں میں جفا و اور استقلال پیدا کریں۔ اسی کے تحت حضور نے اعداء اللہ پر مٹھی بھر کنگریاں

۱۰ قرآن مجید میں نبی کریم صلعم کو خطاب ہے کہ "کنکریں در حقیقت اپنے نہیں پھینکیں بلکہ خدا تعالیٰ نے پھینکیں" تفصیل آگے آتی ہے۔

پھینک ماریں جو انہیں تیر و تینگ ہو کر لگیں۔ اسی کے تحت حضرت خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وسلم نے عزوۃ موتہ کا جو شام میں ہوا مدینہ ہی میں مشاہدہ فرماتے ہوئے
اعلان فرمایا تھا کہ لڑائی کا جھنڈا اب زید بن حارثہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ شہید
ہو گئے۔ اور اب جعفر طیار کے ہاتھ میں آیا اور وہ شہید ہو گئے۔ اور اب عبد اللہ
بن رواحہ کے ہاتھ میں آیا اور وہ بھی شہید ہو گئے۔ اور اب خالد بن ولید کے ہاتھ میں آیا
اور وہ کامیاب ہو گئے۔ نیز اسی کے ماتحت فاروق اعظم نے مہر پر خطبہ پڑھتے
پڑھتے ایک دم شام کی جنگ کی کمان شروع کر دی تھی۔ اور مدینہ سے ڈھائی سو میل
کے فاصلہ پر بغیر کسی لاسلکی کی محتاجگی کے "یا ساریۃ الجبل" کی آواز پہنچا کر جنگ کا
رُخ بدل دیا تھا۔ اسی قوتِ غنائی کے ماتحت بعد وفات نبوی عرب کے ارتداد
کے موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام عرب کے مرتدین کے مقابلہ پر تین تنہا
جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور اسی قوت کے بل بوتہ پر چین کے کھڑوں
انسانوں کو صرف دس پانچ ہی تاجر صحابہ نے جنگ کا الہی میٹم دے دیا تھا۔ اول
اسی قوت کے ماتحت رومیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو حضرت خالد نے
صرف ۶ صحابہ کے لشکر سے شکست دے دی تھی۔ اسی قوت کی بنا پر
قرآن نے فرمایا تھا کہ اگر تم میں بیس صحابہ و متوکل ہوں تو دوسو پر غالب
ہوں گے۔ اور سو ہوں گے تو ایک ہزار کے لئے کافی ہوں گے۔ اسی قوت

لے یعنی اسے ساریہ پہاڑی کہو۔

کے ماتحت حضور علیہ السلام صوم وصال رکھ کر مفتوں کھانا پینا ترک فرما دیتے۔
دو روزہ بیت نبوت سے دھواں نہ اٹھتا اور بقا حیات کے بارہ
میں فرماتے :-

یطعمتی ربی ویسقینی میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اسی قوتِ غنار کے ماتحت اولیاء امت کے زہد و ترک کی قوتیں کار فرما ہوئی ہیں۔
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے اپنی آخری
عمر میں فرمایا کہ افسوس اللہ اب مجھے بقا حیات کے لئے کھانے پینے کی ضرورت
نہیں رہی۔ صرف اتباع سنت کے لئے کھانا پیتا ہوں۔ یعنی ذکر اللہ
ہی غذار کے قائم مقام ہو گیا ہے۔ اسی قوت کے تحت صحابہ کرام لمبے لمبے
ناقول کے ساتھ اور کبھی محض کھجور کی گٹھلیوں کو منہ میں ڈال کر چوستے رہنے
کے ساتھ مسلسل جہاد اور جنگ میں مصروف رہتے تھے۔ اور معمولی سے معمولی
ہتھیاروں، کم سے کم تعداد اور بے سرو سامانی کے ساتھ وقت کی باقاعدہ
مرتب کیل کانٹے سے لیس اور بھاری تعداد کی فوجوں کے ساتھ فاتحانہ جنگ
کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ جنگیں اور یہ احوال زہد و قناعت مادی و سائل
کے رہین منت نہ تھے۔ بلکہ تلبی جوش اعتقاد اور قوت یقین کے آثار تھے
جس میں اسباب سے کمال استغناء اور مسبب الاسباب سے کمال ربط و احتیاج
پس یہ خلافت انبیاء و اولیاء کی ہے۔

ہاں اگر تو یقیناً یقین کے درجہ کی نہ ہو اور غنا و توکل کا مادہِ راسخہ
 قلب میں جڑ پکڑے ہوئے نہ ہو۔ لیکن پھر بھی حق الیقین کے تحت غنا و
 توکل کی بشاشت و طمانیت قلب میں پھیلی ہوئی ہو۔ قلب میں انشراح
 ہو جس میں علم و اخلاق اور صناعات کو ظاہراً تو اسباب سے بے نیاز نہ ہوں
 مگر اعتقاداً ان اسباب و مسائل کی اہمیت و وقعت پر گاہ کے برابر بھی نہ ہو اور
 اسباب اختیار کرتے وقت یہ تصور قلب میں راسخ ہو کہ یہ اسباب محض
 ہمارے ضعیف نفوس کو سہارا دینے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں۔ فی نفسہ انہیں
 کسی ادنیٰ تاثیر کی مجال نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان اسباب و مسببات میں کوئی عقلی
 لزوم ہے کہ اسباب پر نتائج مرتب ہونے ضروری ہوں۔ بلکہ یہ سارا کارخانہ مشیت الہی کے
 تابع ہے جب چاہے ان اسباب پر نتائج مرتب فرما دے جب چاہے روک دے۔ اس لئے اعتماد و
 بھروسہ لائق اسباب نہیں صرف مسبب الاسباب کی ذات بابرکات ہے تو یہ خلافت صلحائے امت
 کی ہوگی۔ جن کا قلب کم سے کم علم و عمل اور صناعات میں محتاجگی و رسائی سے خالی ہوگا۔ گو اعضاء و
 جو اراح خالی نہ ہوں۔ اس قسم کے خلفاء عادل تمام وہی اور واقعی خطرات سے نڈر ہو کہ
 قانونِ شریعت پر چلتے اور چلائے ہیں۔ اور اوامر الہیہ کے مقابلہ میں مخالف حق
 اسباب کا ہجوم انہیں خوف زدہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ ایک رخ ہو کر ایسے تمام
 مادی وسائل کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ پس یہ خلافت
 گو حقیقی نہیں ظاہری ہے مگر شبہ حقیقی ضرور ہوگی۔ امرار عادل کے بہت سے

حیرت ناک تاریخی کارنامے اسی اعتقادی قوت غنا و بیک رخی کے آثار ہیں جس سے اوراق تاریخ پر ہیں۔

پھر اگر یہ غنا و توکل ایک خیال کی صورت سے قلب میں آمد و رفت اور گذر رکھتا ہے نہ جڑ پکڑے ہوئے ہے نہ انشراح میں ہے اور نہ اس کی نشا نشت ہی قلب میں پھیلی ہوئی ہے۔ گویا بسلسلہ اعتقاد اللہ کے معاملات میں نہ عین یقین ہے نہ حق یقین بلکہ ایک اجالی علم یقین ہے جس سے یہ وہ بیان تو آتا رہتا ہے کہ اسباب میں تاثیر خدا کی طرف سے ہے لیکن اس کی کیفیت سے قلب آشنا نہیں جو علم و اخلاق اور صناعات میں بے نیازی اسباب کی عزیمت پیدا کرے تو یہ خلافت عوام مسلمین کی ہوگی جو درحقیقت خلافت ظاہری بھی نہیں بلکہ خلافت ظاہری کا ایک بے جان ڈھانچہ اور کاغذی تصویر کی مانند ہوگا۔ جس میں علم و اخلاق اور صناعات سب کے سب شدت کے ساتھ اسباب ظاہری کے پابند ہوں گے۔ اور اسباب و وسائل کے بے اثر ہونے کی طرف کوئی ذہنی التفات نہ ہوگا بلکہ اسباب و مسببات میں لزوم کا تصور بہر وقت ذہن پر چھایا ہوا ہوگا۔ جس سے مسبب الاسباب پر بھروسہ اور اطمینان کی وہ کیفیت نہ ہوگی جو مطلوب ہے گو اس کی تکذیب بھی ذہن میں نہ ہوگی۔ اس درجہ کے ادارہ و خلفاء معاشی مہمات اور بقا و افتداری کی ضروریات میں توجہ چاق و چوبند ہوتے ہیں لیکن اللہ کے معاملات میں سست پس و پیش کا شکار اور رسمی اندیشوں اور مصلحت

آفرینیوں میں گرفتار ہوں گے۔ اور کبھی بھی اپنے داعیہ باطن سے خلافت کے حقیقی نصب العین کے احیاء و تکمیل کی طرف مائل نہ ہوں گے۔ یوں اتفاقات وقت اور احوال و عوارض کی مجبوریوں سے اعلیٰ کلمۃ اللہ کا کوئی کام ان سے سرزد ہو جائے تو یہ احوال کا نتیجہ ہو گا خود ان کے کسی عزم و جزم کا اثر نہیں ہو گا۔

اور اگر غنا و توکل صرف درجہ قال میں نوک زبان ہے قلب میں اس کا کوئی ریشہ جاگزیں نہیں اور یہ قال بے خیال بھی کسی روایتی مجبوری یا نہ وال اقتدار کے خوف یا مسلم قومیت سے خارج سمجھ لئے جانے کے خطرہ سے ہو گیا زبان سے یہ کہنا بھی کہ ”کرتا دھرتا خدا ہی ہے اسباب میں کیا رکھا ہوا ہے؟“ بطور

یرضو فکم باقواھم۔ زبانوں سے نہیں راضی رکھنا چاہتے

ہیں۔ اور دل ان کے سے انکاری ہیں۔

وتابی قلوبہم۔

کے ہو تو یہاں نہ صرف اسباب ظاہری کی اسیری اور محتاجگی ہی ہوگی بلکہ انہی پر پورا بھروسہ اور اعتماد بھی ہوگا۔ اور ان کے مرنے نہ ہونے پر ہی قلب کی تسکین اور تشویش کا مدار ہوگا۔ نیز اسباب میں یہ غلو اور مبالغہ ہی مسبب الاسباب سے بیگانگی اور بے تعلقی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ پس یہ خلافت نہیں صرف ادغام خلافت ہوگا۔ یعنی خلافت قالی ہوگی جو قوت یقین کے کا عدم ہونے

کے سبب محض صورت یقین سے زبانی دعویٰ کی صورت سے سرزد ہوگی۔
 ظاہر ہے کہ جو نوعیت اس اسلام کی ہے جو صرف زبان پر ہو دل میں نہ ہو وہی
 نوعیت اس خلافت کی بھی ہوگی۔ اور اس کے بعد کھلے کفر کا مقام ہے جہاں
 صرف بندگی اسباب ہے عبادت مسبب الاسباب نہیں سو اس میں خلافت
 یا غنار و توکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام قلبی جذبات اور باطنی ہستیات
 عمل سے کھل جاتی ہیں۔ اور عمل ہی ان قلبی مقامات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔
 بہر حال اس سے خلافت کی نوعیت اور اس کے مراتب و درجات کے
 ساتھ اس کی روح واضح ہوگئی کہ وہ غنار و توکل اور بے نیاری اسباب
 سے۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت الہی کے معنی علم و عمل اور صنعت و افعال
 وغیرہ میں مادی اسباب سے منقطع ہونے کے نہیں بلکہ عملاً یا اعتقاداً ان سے
 بے نیاز ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ خود حق تعالیٰ شانہ نے بھی اس غنار مطلق کے
 باوجود اسباب بھی پیدا کئے۔ اور اپنی قوتوں کو عادتاً انہی کے ضمن میں نمایاں
 بھی فرمایا۔ اس لئے اسباب جنگ کے سلسلہ میں ہتھیار اسباب صنائع کے
 سلسلہ میں اوزار اور اسباب معاش کے سلسلہ میں کار و بار اپنی جگہ رہے
 گا۔ مگر نہ دل میں ان وسائل کی اہمیت اور محتاجگی ہوگی اور نہ عملاً اختیار
 وسائل میں غلو اور مبالغہ۔ اس لئے واعد والہم ما استطعتم کے
 فرمان قدسی نشان پر اس سے کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دشمنان حق و عداقت کے

مقابلہ میں یہ اعداد مستطاع را مکانی تیاری اپنی جگہ رہے گی۔ اور وہ قلبی غنار اور عملی عدم مبالغہ اپنی جگہ۔ پس آیت کریمہ نے امکانی تیاری کا حکم دیا ہے۔ اس کی نوعیت اور کیفیت پر روشنی نہیں ڈالی کہ وہ کتنی اور کیسی ہونی چاہیے۔ اس لئے اس امکانی تیاری کی ہدایت تو اس آیت سے حاصل کی جائے گی۔ اور اس کی نوعیت و کیفیت انبیاء علیہم السلام کے طرز عمل اور اولیاء و صلحاء کے طرز اتباع سے اخذ کی جائے گی۔ اور وہ وہی غنائمیز جدوجہد ہوگی جس کی طرف سابق میں چند واقعات سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

پھر یہ صرف شرعی حقیقت نہیں بلکہ دنیا کے عرف عام میں بھی کمال غنائم کو سمجھا گیا ہے۔ یعنی کمال وہی مانا گیا ہے جو نفس کا جوہر ہو اور اپنے ظہور میں نہ وسائل ظاہری پر معلق ہو نہ ان کا محتاج ہو۔ ایک فنون جنگ سے واقف کار سپاہی جو ہتھیار چلانا جانتا ہے یقیناً اس ناواقف سے بڑھا ہوا سمجھا گیا ہے۔ جو ہتھیار اٹھانا بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ اول الذکر اپنی حفاظت کے لئے دوسرے کا محتاج نہیں اور ثانی الذکر ہے۔ پس بنا رضیت وہی غنار نکلا۔

پھر اس سے بھی بزرگ وہ ہے جو نہتہ ہونے کے باوجود محض ہاتھ کے داؤ پیچ سے دوسرے کے ہتھیار چھین کر اسے نہتہ کر دے اور خود مسلح ہو جائے۔ کیونکہ وہ ہتھیار کا بھی محتاج نہ نکلا جو پہلے غنار سے اونچا غنار ہے۔ اس سے

بھی آگے وہ ہے جو نفس کی کسی اندرونی طاقت مثلاً نگاہ کو ریاضت سے مضبوط بنا کر محض آنکھ کی گھورہی سے حریف کو گرا لے۔ اور نگاہ سے پتھر تک توڑ ڈالے۔ جیسے مسیرم والے کرتے ہیں۔ پس یہ ہتھیار چھوڑ ہاتھ پیر ہلانے کا بھی محتاج نہ رہا۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ سمجھا گیا ہے جو قوت خیال کی طاقت سے چند کلمات ہی کے ذریعہ دشمن کو زیر کر دے جیسے سحر کی طاقت ہے خواہ وہ سحر حلال ہو یا سحر حرام جسے ریاضت سے حاصل کر لیا جاتا ہے پس یہ ہتھیار ہاتھ، پیر، اور آنکھ کا بھی محتاج نہ رہا۔ صرف زبان ہلا کر ہی حریف کو گرا لیتا ہے۔

اس سے بھی اونچا وہ مانا گیا ہے جو روحانیت کی بے پناہ طاقت سے دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کر ڈالے اور اپنی ہمت باطن سے دلوں کو لوٹ دے جس سے دل مرعوب ہو جائیں اور مسلح ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جائیں۔ گویا یہ نہ سامان کا محتاج نہ بدن کا محتاج نہ نفس کا محتاج۔ صرف روح کا کارکن نمائندہ ہو۔ خواہ اس طاقت کا ظہور تلوار ہی کے راستے سے ہو۔ مگر اس صورت میں تلوار نحض حیدرہ کے درجہ میں ہوتی ہے اصل کام اندرونی قوت کرتی ہے اور اس طرح یہ تمام وسائل ایسے شخص کے سامنے بے اثر و حقیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

اور جب کہ عام قلوب میں ہر اگلے درجہ والے مستغنی کی عظمت و عقیدت
سابقہ درجہ والے سے بڑھتی چلی جاتی ہے تو اس سے اندازہ ہو جاتا ہے
کہ عرف عام میں بھی طاقت کی حقیقت و مسائل سے بے نیازی ہے مسائل
کی محتاجی نہیں

یہی وجہ ہے کہ پچھلے لوگ حسی مادوں کے بجائے زیادہ تر نفسانی اور معنوی
قوتوں کی تسخیر کو کمال سمجھتے تھے اور ان کا مرکز توجہ زیادہ تر طلسمات، نیز نجات
نجومیات، فلکیات، نفوس عناصر و افلاک اور خود نفس انسانی کی اندرونی
طاقتیں رہیں جنہیں شاق شاق ریاضتوں سے مسخر کیا جاتا۔ اور اپنے نفس
کو ان معنوی قوتوں سے قوی کر کے ظواہر سے بے نیاز بنا لیا جاتا۔ بعض نفوس
عناصر کی تسخیر کر کے حقائق عناصر تک جا پہنچے۔ بعض نے نفوس فلکیہ اور
ارواح سیارات سے کنکشن کیا۔ اور عجائبات افلاک پر مطلع ہوئے۔
بعض نے ارواح سفلی و علوی سے جوڑ لگایا۔ اور اپنے نفس میں خودی کی
طاقت پیدا کی۔ بعض نے یہ دیکھ کر کہ ان تمام کائناتی طاقتوں سے کہیں
زیادہ طاقتیں خود انسان کے نفس میں موجود ہیں۔ خود اپنی ہی اندرونی
قوتوں جو اس خمسہ ظاہرہ اور اس سے اوپر جو اس خمسہ باطنہ کی طاقتوں کو
ریاضت نفس کے ذریعہ ایک مرکز پر سمیٹا مسخر کیا۔ اور ان سے بلا وساطت
ظاہری کار فرما ہوئے۔ غرض ان سب غیر محسوس شعبوں میں تسخیر معنویات کر کے

خود اپنی معنویت اس درجہ پر لے آتے تھے۔ کہ وسائل کی محتاجگی باقی نہ رہے۔ اور یہ نفس جہاں بھی ہو یا کمال ہو۔ یہ نہ ہو کہ آلات و وسائل کے جہان میں تو نفس یا کمال ہو اور اس سے الگ ہو کہ بے ہنر ہو جائے۔ یہ بے نیازی اگر عین خلافت نہ تھی تو کم از کم شبہ خلافت ضرور تھی۔

اسلام نے ان تمام طاقتوں کو مخلوقاتی طاقتیں بتلاتے ہوئے۔ انسان کو خدا کی لطیف اور لامحدود طاقتوں سے مستفید ہونے کی طرف متوجہ کیا۔ اور ارضیات، ملکیات، نفسیات یعنی تمام سفلیات و علویات سے گزار کر الہیات کی لامحدود وسعتوں میں پہنچا دیا جو تمام روحانی اور مادی طاقتوں کا سرچشمہ ہیں۔ مگر اس طاقت سے استفادہ کا راستہ اتباع انبیاء بتلایا کیونکہ یہ کوئی کربتی راستہ نہ تھا کہ فنی طور پر اسے سیکھ کر کوئی مشق بہم پہنچائی جائے اور اس سے شہدے اور کتب دکھا دیئے جاتے رہیں۔ بلکہ ایک ارتقائی اور استکمالی راستہ تھا جس سے سعادت انسانی تکمیل پیش نظر تھی جو تخلیق انسانی کی اصلی غرض و غایت۔ اور تماشگی الہی کی حقیقی روح ہے تاکہ اس الہی طاقت سے انسانی طاقت کے عملاً حد کمال پر آجانے سے انسان کا استغناء اور وسائل ظاہری سے بے نیازی بھی حد کمال پر آجائے اور اس طرح اس میں خلافت الہی اپنی حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

لیکن آج کی مادہ پرست قوموں کی تمام تر نہت حسنی مادوں کی تسخیر اور ان کی
 حسنی خاصیتوں کو آلات کے ذریعہ ابھارا بھار کر کچھ بدنی منافع حاصل کرتے رہنے
 میں محدود ہو چکی ہے۔ ان کی طرف سے روحانیت اور معنویت رہے یا جائے
 سب برابر ہے۔ وہ مشینزی آلات کے ذریعہ مادوں کے جگہ میں گھس کر فنانی المادہ
 ہو چکی ہیں۔ گویا سائنس کی راہوں سے انسان اپنی معنوی قوتوں کا ذخیرہ لوہے لکڑی
 اور پینل کو سوئپ کر خود کو راہو بیٹھا ہے۔ اگر یہ سامان فراہم ہے تو وہ باکمال ہے
 ورنہ بے کمال پہلی صورت میں انسان باکمال بنا تھا۔ اور اس دوسری صورت
 میں انسان کو آہ کار بنا کر لوہا لکڑی اور برق و بخار وغیرہ اپنے کمال ظاہر کرتے
 ہیں۔ چنانچہ ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں انسان بے ہنر اور عاجز
 بن جاتا ہے یہ انسانیت کی اتھانی پستی اور بیچ میرزی ہے کہ اس نے اپنی
 جوہری طاقتیں ختم کر کے لوہے پتیل کو سپرد کر دیں اور خود ان کا دیویوزہ کر
 لیا گیا۔ اور پہلے لوگوں کا یہ اعلیٰ ترین عروج تھا کہ وہ اس لوہے پتیل کی ^{تقسیم}
 ان سے چھین کر خود اپنے نفس کو قوی مضبوط اور باکمال بنا لیتے۔ اور ان
 اختیار کو صرف ایک جملہ کی حیثیت سے اختیار کئے رہتے تھے۔ نظر ان
 کی مسبب الاسباب پر ہوتی تھی۔ اسی لئے جن میں یہ غنا حد کمال کو پہنچ جاتا
 تھا وہ عملاً بھی ان وسائل کے بغیر اپنے کمال کا اظہار کر سکتے تھے۔

پس آج کا انسان الہیات اور فلکیات کی تو کیا عنصریات کی اور دماغ

نفس حتی کہ خود اپنی نفسیات کو بھی اپنے اندر جذب نہ کر سکا۔ وہ آکر گرا تو جسمانیات
 اور وہ بھی فلکی نہیں سفلی اور سفلیات میں بھی محض مادویات اور حسیات اور وہ بھی
 محتاجی آلات و وسائل میں آکر گرا جس سے اس کی دیر یوزہ گری اور محتاجی یا
 پابگی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور وہ شرف انسانیات جو عنار و بے نیازی سے پیدا
 ہوتا، خاک میں مل گیا جو بلاشبہ انسانیات کی حد سے گری ہوئی لستی اور ذلت
 و رماندگی ہے۔ مگر طرہ اس پر یہ ہے کہ اس ذلت و لستی پر رب العزت کی
 خلافت کا دعویٰ اتنا کہ زمین و آسمان ایک کر دیا گیا ہے۔ پس جاتو رہی ہے
 انسانیات حقیقت ذات کی طرف اور بر خود غلط زعم کیا جا رہا ہے اس کے
 اور ج رفعت پر پہنچ جانے کا۔ اور نہ صرف رفعت و عزت ہی کا بلکہ اللہ کے
 واحد نمائندہ اور خلیفہ بن جانے کا۔ ولایینال عہدی الظلمین

پس اگر خلافت الہی سے ایشیہ اور اقرب کچھ طرز عمل تھا تو ان پچھلوں کا
 تو تھا جو معنوی اور نفسانی کمال پیدا کر کے طلسمات و نیز سجات وغیرہ کی صورت
 میں نفس کو ظواہر سے بے نیاز کر لیتے تھے۔ گو ان میں بعض مبطل تھے اور بعض
 حق یعنی روحانیت والے کمال استغناء پیدا کر کے حقیقی خلافت کے مقام پر آ جاتے
 تھے۔ اور یہ نفس یا آفاق کی مخفی طاقتوں کے فخر کنندے خلافت کی شبیہ اختیار
 کر کے خلفاء کے مشابہ بن جاتے تھے۔ لیکن آج کے مادہ پرست طبقے خالص
 حسیات کے خوگر بن کر اور مادویات کے محتاج محض ہو کر نہ صرف خلافت اور

شبہ خلافت ہی سے بعید ہیں بلکہ خلافت کی صورت و حقیقت دونوں ہی کے لئے محرب ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ ان کے یہاں خلافت کی اولین نشست غنارہ و استغفار ہی ندارد وہے تا بعمارت خلافت چہ رسد؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ استغفار و سائل کا اعتقاد یا حال کئے بغیر ان مادی اسباب کے طبعی خواص و آثار ظاہر نہ ہوں گے۔ بلکہ یہ ہے کہ خلافت کا تحقق نہ ہوگا۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی بہت سی مادہ پرست اقوام سے ان اعتقادات و احوال کے بغیر بھی مافوق العادت صنایعوں اور مادی اختراعات کا ظہور ہوا۔ اور آج بھی بہت سی مادی قومیں ان وسائل سے بلا اعتقاد تاثیر الہی تمدن کے حیرت ناک کرشمے دکھلا رہی ہیں جس سے سطحی طور پر ان کے خلفاء الہی اور ایجاد و اختراع میں نائب خداوندی ہونے کا شبہ بھی ہونے لگتا ہے لیکن یہ خلافت نہیں صورت خلافت کی ایک ظلماتی پرچھائیں ہے۔ جس میں نہ صرف یہ کہ خلافت کی روح (غنارہ و توکل) موجود نہیں بلکہ اس کی ضد موجود ہے۔ پس طبعی خواص و آثار کا تحقق یہاں ضرور موجود ہے۔ مگر منصب خلافت اس کے آس پاس بھی نہیں صرف استدراجاً یہ مادی کرشمے ان کے ہاتھوں نمایاں کئے جا رہے ہیں نہ کہ کسی مقبولیت کی بنا پر جو روح خلافت ہے۔ پس جیسے کھانے پینے میں ذائقہ نیت پر موقوف نہیں مگر اجر و ثواب نیت پر موقوف ہے۔ ایسے ہی مادیات کے طبعی آثار و خواص کا ابراز غنارہ اسباب کے عقیدہ یا حال پر موقوف نہیں لیکن

خلافت کا منصب اور خدا کا مقبول نائب ہونا بلاشبہ اس غنارہ و توکل کی
شان پر معلق ہے۔

پس جو قومیں رات دن لوہے، لکڑی، اینٹ، پتھر اور عام مادی وسا
کی محتاجگی اور غلامی میں نہ صرف بسر ہی کر رہی ہیں بلکہ ان مادیات کی بندشوں
نے ان کے خیال تک کو اپنا اسیر اور قیدی بنا لیا ہے جس سے وہ روحانیت
سے بیگانہ اور منقطع ہیں۔ نہ وہ غنارہ و توکل سے عقیدہ سرفراز ہیں نہ حالاً تو
انہیں خلافت الہی سے کیا تعلق کہ خلافت الہی کی توخشت اول ہی ان مسائل
سے غنارہ ہے حالاً ہو یا اعتقاداً۔ خلیفہ الہی متورہ و آ رہ اور بسولہ و نہان سے
نہیں بن سکتا بلکہ علم و اخلاق اور صنعت کاری میں غنارہ و توکل کے درجات
طے کرنے سے ہوتا ہے۔ اگر علم بے کتاب و بے معید و اوستا کا مصداق بن کر
علم لدنی بن جائے۔ اخلاق تخلق یا خلاق اللہ کا مصداق ہو کر خلق حسن ہو جائے
قول گفتہ او گفتہ اللہ ہو و کا مصداق ہو کر القار و الہام اور فراست بن جائے
اور فعل و مارمیت اذرمیت و لکن اللہ رضی کا مصداق بن کر فعل صدق
ہو جائے۔ گویا اس کا کہا ہوا اور کیا ہوا اس کا نہ ہو بلکہ اس کے خدا کا کہا ہوا
اور کیا ہوا ہو۔ اور وہ حقیقی معنی میں قولاً و فعلاً نماندہ حق ہو جائے تو خلافت
کامل ہوگی ورنہ حسب نقص درجات ناقص رہ جائے گی۔ اب جن اقوام میں
خلافت کی یہ بنیاد ہی نہ رہے ہو نہ عقیدہ موجود ہو نہ حالاً تو ان پر منصب

خلافت کو چسپاں کر کے انہیں خلفاءِ الہی یا عملی مومن کہنا اور ان کے مقابلہ میں مسلم
اقوام کو جو کم از کم عقیدتاً ان مادی اسباب کو باوجود استعمال کرنے کے کوئی
اہمیت نہیں دیتیں بلکہ صرف مسبب الاسباب ہی کو موثر حقیقی مانتی ہیں عملی کار
اور لفظی مومن کہنا کہاں کا انصاف اور حق پسندی ہے اگرچہ وہ محکوم ہی کیوں

نہ ہوں۔ ول بعد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم

مگر یہ غنا حقیقی جو ان تینوں خلافتوں علمی، اخلاقی اور صنعتی و انفعالی کی روح
ہے اسی وقت نصیب ہو سکتا ہے جب اللہ کے علمی قرآن یعنی کتاب اللہ
سے تو علم حاصل کیا جائے۔ اور اس کے استدلالی اور برہانی قرآن یعنی
کائنات اللہ کی محسوس مثالوں سے اس کی معنویات کو سمجھا جائے۔ اور اس
کے اخلاقی اور تعمیلی قرآن یعنی رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ سے عمل بالقرآن
کا ڈھنگ سیکھا جائے اور عملی دستور زندگی بنا کر زندگی کے ہر گوشہ میں جذبہ
اتباع سنت کے ساتھ اس کی پیروی کی جائے۔ پس کتابی قرآن حق کاراستہ
دکھائے گا۔ کائناتی قرآن اس راستہ کو فہم کی گہرائیوں میں اتارے گا۔ اور اللہ کا
عملی قرآن یعنی رسول برحق اپنے عملی اسووں سے اس پر عمل کرائے گا۔ جس سے
نفس میں ملکاتِ خلافت راہیں کھولے اور ظاہر ہے کہ جب علم کتاب اور
دلائل علم کتاب سے مقصود اثبات مدعا ہے۔ اور مدعا سے مقصود اس پر
عمل پیرائی ہے۔ اور عمل کا نمونہ رسول کی ذات ہے تو تینوں قرآنوں کا

حقیقی مقصد اسوۂ رسول پر چلنا نکل آتا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ اس علمی قرآن کا عملی پہلو یہ کائنات نہیں کہ وہ تو صرف تمثیلی اور بہانی قرآن ہے۔ بلکہ عملی قرآن ذات محمدی ہے جس نے قرآنی ہدایات کو براہ راست صاحب قرآن (حق تعالیٰ) سے سمجھ کر اس پر عمل کرنا سیکھا اسے کہے دکھایا۔ اور ہر ہر ہدایت قرآنی کا عملی خاکہ اور نمونہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس لئے اس عملی قرآن کے نقش قدم کی پیروی ہی فی الحقیقت قرآنی ترقی ایماندارہی اور خلافت الہی ہوگی۔ پس قرآن کا اصل مقصد اتباع سنت اور اقتداء سے اسوۂ حسنہ نکل آتا ہے جس کے لئے یہ ساری کائنات ایک وسیلہ محض رہ جاتی ہے۔ نہ یہ کہ اس عملی قرآن (ذات نبوی) کے نمونہ عمل سے تو قطع نظر کر لی جائے اور علمی قرآن یعنی کتاب اللہ کی محض تعبیرات کو لے کر اپنے مقاصد کی بلاغت بیانی کا آلہ کار بنا لیا جائے کہ تعبیرات قرآن کی ہوں۔ اور ذہنی منصوبے اپنے ہوں جن کو اس کی بلاغت بیانی کے پردوں میں چھپا کر پیش کر دیا جائے۔ اور اس اسلوب پر قرآنی مقصد مادہ کی توڑ پھوٹ اور مادی تصرفات ٹھہرا کر اس کا نام عمل بالقرآن رکھ لیا جائے۔ اگر یہی عمل بالقرآن ہے تو اس سے زیادہ گھائے کا سودا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ اس مادی صنعت گری کو قرآنی عمل کہہ کر حیب صرف مادہ کی توڑ پھوٹ ہی میں عمر عزیز گنوا دی جائے گی تو یہ مادہ اور مادی لذات تو یوں نہ رہیں گی کہ وہ ختم عمر پر ختم ہو جائیں گی اور آخر وی

لذات یوں نہ ہوں گی کہ انہیں مقصود بنا کر دنیا میں ان کی تحصیل و تکمیل کا ارادہ ہی نہیں
 کیا گیا تھا تو یہ صحیح معنی میں خسر الدنیا و الآخرہ کا مصداق ہو جائے گا۔ جس کا خلاصہ دوسرے
 الفاظ میں یہ ہے کہ یہ توڑ پھوڑ کنندہ بندہ سائنس یا عبدالاسباب خلیفہ الہی تو یوں
 نہ بنا کہ بندگی اسباب کے ساتھ یہ مادی تصرفات بلا روحانیت اور بلا غناہ نفس خلافت
 نہیں خلافت کا لاشعہ میں جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور آخرت میں خلیفہ یوں
 نہ ثابت ہوگا کہ بنا خلافت یعنی مستغنیانہ علم غنیانہ اخلاق اور بے نیازانہ کسب و
 عمل اس نے مقصد قرآن ہی نہیں سمجھا کہ اسے اختیار کرنا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ
 ہے کہ یہ نفس ناکارہ علم و معرفت سے کورارہ کہ جہان مابعد میں اس طرح پہنچے
 گا کہ نہ تو وہ اللہ ہی کا خلیفہ اور نمائندہ ہوگا کہ مادی وسائل سے بے نیاز ہی سمیٹیں
 قائم ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ وہ اپنا ہی نمائندہ ہوگا کہ وہاں اس کو رکے اور عاری
 نفس کی وہ خودی اور خود داری قائم نہ رہے گی جو دنیا میں ان فانی وسائل پر
 بننا، انجن مشین اور لوہے لکڑی کے بل بوتہ پر قائم تھی تو صحیح معنی میں یہ نفس
 خسران دنیا اور حرمان آخرت کا مورد ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس طرح یہ نام نہاد
 خلافت خلافت نہیں حماقت ثابت ہوگی۔ اگر معاذ اللہ عمل بالقرآن کا نتیجہ ہی
 حرمان و خسران دایرین ہے تو قرآن کو دنیا میں آنے اور اچھی خاصی مخلوق کو جو
 قیصر و کسریٰ کے زیر پرستی خلیفہ الہی نبی ہوئی تھی دایرین کے حرمان و خسران
 میں مبتلا کرنے کی آخر کیا ضرورت پیش آتی تھی؟

رہانی نفسہ صنعت و حرفت اور مادی تصرفات کا سوال یہ سونہ قرآن اس کا مخالف ہے نہ دین نے اس سے مماثلت کی ہے اور نہ کوئی عقلمند اس کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے۔ دنیا میں رہ کر دنیوی ضروریات سے روک دیا جانا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے مگر یہ

کار نبی اکن و اندیشہ عقبتی مگذار

تا بعقبی نہ رسی و امن دنیا مگذار

یعنی یہ ضرور ہے کہ یہ صنائع اور مکاسب اصول قرآنی کی رو سے دابین میں کار آمد اور موجب فلاح حیب ہی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خود مقصود نہ ہوں بلکہ کسی اونچے نصب العین کے وسیلہ کی حیثیت سے استعمال میں آئیں جن میں نہ غلو ہو نہ مبالغہ اور نہ ان کے ساتھ مقاصد کا سا غیر معمولی شغف اور دلچسپی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نصب العین ہی خلافت ہے جس کا حاصل اعلیٰ کلمۃ اللہ ہے اور جس کا طریقہ خدائی علم سے آراستہ ہونا۔ خدائی اخلاق سے متخلق ہونا اور خدائی رنگ صنعت گیری سے رنگین ہونا ہے۔ اور سب کی بنیاد وہی غنا عن الوسائل ہے نہ عشق و سائل اس لئے مادی وسائل اور مادی تصرفات خود خلافت نہیں بلکہ خلافت کے ادنیٰ ترین وسائل ثابت ہوتے ہیں۔ اور کسی طرح جائز نہیں ٹھہرنا کہ انہیں مقصود اصلی سمجھنے یا ان کے ساتھ مقصود کا سا برتاؤ کرنے اور ان میں ڈوب جانے کو عین ایمانداری خلافت خداوندی

اور ایمان و تقویٰ پکارا جانے لگے۔ کہ ایسا کتنا دین کا حلیہ لگا کر بنا اور اسے اوجھڑ
 کر از خود بنا اور وہ بھی سونے کے بجائے زنگ آلود سیاہ لوہے کے تار
 سے بنا ہے جو نہ خوش نما ہے نہ بقا پذیر ہے نہ مقبول ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دین صحت و حرمت اور تسخیر عالم میں کمال
 حاصل کرنے یا اس پر قابو پالینے کا تو مخالف نہیں مگر اس کے نزدیک عام
 طبعی ضروریات زندگی کے معمولی کسب و اکتساب کو چھوڑ کر ایجاد و اختراع اور
 تسخیر کائنات کا مطلوبہ طریقہ مادی تصرف نہیں بلکہ روحانی تصرف ہے۔ عام کو
 مادی طاقت سے زیر کرنا نہیں بلکہ روحانی قوت سے قابو میں لانا ہے جو
 اسباب و وسائل مادیہ سے بے نیاز طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی تصرفات
 کاراستہ عقل و استدلال سے طے نہیں ہوتا بلکہ عشق الہی اور اتباع نبوی
 کے شغف سے طے ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مادی اسباب
 میں غلو اور مبالغہ سے طبیعت کو روکنے کی خواہش پیدا کر لی جائے۔ یہ راستہ
 مضبوط بھی ہے اور دوامی بھی ہے جو دنیا سے لے کر آخرت تک قائم رہتا
 ہے۔ اور اس پر مسافت ہر وقت اور ہر عالم میں ممکن رہتی ہے۔ گویا آخرت
 بھی بنتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ بخلاف مادیت محضہ اور وسایل
 تصرفات کے کہ یہ راستہ جو بہری راستہ بھی نہیں جو صرف انسان کی اندو
 طاقت سے طے ہو۔ اور ملحوظ نتیجہ یقینی اور قطعی بھی نہیں کہ اس پر ثمرات کا

مرتب ہونا لازمی ہو پھر ہر ایک کے لئے عام بھی نہیں کہ سب کو یہ وسائل تمیز
 ہی آجائیں۔ اور ساتھ ہی پائدار بھی نہیں کیونکہ آخرت کی پہلی ہی منزل پر یہ تمام
 وسائل اور تصرفات بیکار ثابت ہوتے ہیں جس سے دنیا تو ختم ہو جاتی ہے۔
 اور آخرت بنتی نہیں۔ پس پہلا راستہ توفی الدنیا حسنتہ و فی الآئرت حسنتہ
 کا مصداق ہے۔ اور دوسرا راستہ خسر الدنیا و الآئرتہ کا مصداق ہے۔
 حاصل یہ ہے کہ اسلام صنعت گری کی قوت پیدا کرنے اور اسے ظہور میں لانے
 کا مخالف نہیں بلکہ داعی ہے۔ مگر اپنے ہی راستہ سے سوہ چاہتا ہے کہ یہ
 خلیفہ الہی حقائق کائنات پر مطلع ہو۔ اور ان کا گہرا مطالعہ بھی کرے مگر محض پیشانی
 کی آنکھ سے نہیں بلکہ پیش آنی کی آنکھ سے وہ ان میں تصرفات بھی کرے۔ مگر
 خارجی وسائل کا محتاج ہو کر نہیں بلکہ خود اپنی اندرونی طاقت کے بل بوتہ پر۔
 پس خارجی وسائل کی محتاجگی سے مادہ کی توڑ پھوڑ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی
 ظلماتی پر چھائیں ہے۔ جو ہمیشہ اصل کے خلاف چلتی ہے۔

لیکن پھر بھی جو لوگ اس واضح حقیقت کے برخلاف کائنات میں محض مادی
 تصرفات اور مادی توڑ پھوڑ میں مبالغہ اور غلو ہی کو سب کچھ جانتے ہیں
 اور اسی کو ایمان داری اور خلافتِ کبریٰ سمجھ رہے ہیں۔ ان کی غلطی کا منشا وہی
 صحیفہ کائنات کو قرآن کا عملی پہلو سمجھ کر اسے عملی قرآن کا لقب دے دینا اور اسی
 سے عملی نمونے اخذ کرنا ہے۔ درحالیکہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ صحیفہ کائنات عملی

قرآن نہیں جس سے عمل کے نمونے لئے جائیں بلکہ صرف تیشلی اور بہانی قرآن ہے۔
 جس سے نظریات قرآنی کے اثبات کے لئے دلائل نظر و فکر کے نمونے لے کر
 نظر کو مصنوع سے صانع تک پہنچانا ہے وہ خود انسان کے لئے عمل نہیں کہ
 اس کے مادوں کی توڑ پھوڑ کو مقصد حیات سمجھ کر رات دن اسی کے جوڑ توڑ
 سے اسی کی مادی گہرائیوں میں غرق ہو جانا اور وہ خان و بخار اور برق و باد وغیرہ
 کے نئے نئے نمونوں کو قابو میں لا کر دنیا پر انہیں آزمانا ہے جس کا نتیجہ خود کو اور
 ساری دنیا کو برباد کرتے رہنا ہے پس عملی قرآن جس سے قرآن کے تقاضا کو وہ عملی
 نمونے اور اسوے اخذ کئے جائیں کائنات نہیں بلکہ پیغمبر کی ذات ہے۔
 کائنات و عبادی قرآنی کے لئے صرف حسی دلائل کا مجموعہ ہے نہ کہ ان دعاوی کا
 تقاضا کو وہ عمل۔ پس اسوہ اور نمونہ صرف اسی ذات باریکات سے حاصل
 کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ذات نبوی کے اس اسوہ حسنہ اور نمونہ عمل
 کی روح مادی شغف نہیں بلکہ وہی علم الہی، غنار کامل، و وسائل مادی سے
 بے نیازی، اور ان پر روحانی تسخیر و تصرف سے قابو پانا ہے جو آپ کے ہر
 شعبہ زندگی سے نمایاں ہے۔ پس آپ کے یہاں اسباب معاش کی فراہمی ضرور
 ہے مگر اجمال طلب اور توکل کے ساتھ بہادری میں ہتھیار ضرور ہاتھ میں ہے۔ مگر
 ہتھیار کی قوت سے زیادہ قوت یقین اور انابت الی اللہ کی طاقت آگے آگے
 ہے۔ نظم ملت کا سامان بھی ہے۔ مگر اسی تشکیلات اور وسائل عامہ کے راستہ

سے نہیں بلکہ ایمان باللہ اور عمل صالح کے راستہ سے ۔

ظاہر ہے کہ اس فرق کے بعد ”دو قرآن“ کا نظریہ باقی نہیں رہتا کہ جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے ۔ اگر نظریہ بنتا ہے تو ”تین قرآن“ کا بنتا ہے کہ ایک اللہ کا علمی قرآن ہے جو اوراق میں مرقوم ہے یعنی کتاب اللہ ۔ ایک اس کا برہانی اور تمثیلی قرآن ہے جو اوراق عناصر و مواد میں مکتوم ہے یعنی کائنات اللہ جسے خلطی سے عملی قرآن باور کرا دیا گیا ہے) اور ایک اللہ کا عملی قرآن ہے جو ذات محمدی میں معصوم ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جسے کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔)

نظریہ کے بدل جانے سے قدرتا مسائل کا رخ بھی بدل گیا ۔ یعنی عملی قرآن ذات نبوی ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ مسائل قائم نہیں رہ سکتے کہ قرآن کی رو سے مسلمان کی اصلی ترقی کا میدان ہواؤں میں اڑنا، بادلوں میں گھس جانا ۔ زمینی مسافتیں برق و باد سے لمحوں میں طے کر لینا، لاسلکی سے مشرق و مغرب کی خبروں کو ایک کر دینا، ایکسے وغیرہ سے بدن کے چھپے ہوئے امراض کا سراغ لگا لینا، دل کی دھڑکنوں کے اسباب و علل پر بذریعہ آلات مطلع ہو جانا اور رحم مادر کے مکتونات کو باہر لے آنا، یا پھر ان اسباب کی مفرطانہ تجارت سے رسمی جاہ و جلال اور کروشہ پیدا کر لینا ۔ یا ان میں سے ہلک آلات سے دنیا پر استیذا اور اقوام دنیا پر استعباد (غلام سازی) مسلط کر دینا وغیرہ وغیرہ

سے۔ بلکہ اب ہم انسانی ترقی کو صحیفہ کائنات میں ڈھونڈنے کے بجائے ذات نبوی کے اسوہ میں تلاش کریں گے۔ تو وہاں اس نمائندگی خلافت یا تخریبی خلافت کے نمونوں کے بجائے تعمیری خلافت اور عمل بالقرآن کے نمونے ملیں گے جن کی روح علم الہی معرفت ذات و صفات، عظمت شراع، اخلاق ربانی، غنا و ایثار۔ خدمت خلق اللہ اور خلق الہی کو مادیات کے دلدل سے نکال کر روحانیت کے میدان میں پہنچانا۔ اور نفسانی عیش سے روحانی لذت کی طرف منتقل کرنا نمایاں ہوگا۔ وہاں تضامیں اڑنے کے بجائے روحانی تضادوں میں عروج کیا۔ مشرق و مغرب ایک کر دینے کے بجائے الہیاتی علوم سے عرش سے فرشتہ کو ایک کر دینا اور فرشتہ زمین کو عرش بریں کی الہی خبروں سے منور بنا دینا۔ بدن کے امراض کے بجائے قلوب و نفوس کے چھپے ہوئے مریضوں اور روگ کھول دینا جن کی اصلاح سے بدن بھی صالح بن جائے۔ دل کی حسرت بھڑکنوں پر مطلع ہونے کے بجائے لطیفہ رت قلب کی کھٹک اور پراگندگیوں پر مطلع ہو کر سکون قلب کا سامان مہیا کرنا جس سے یہ صنوبری مضغہ گوشت بھی ساکن ہو جائے رجم مادہ کے لکڑنات کھولنے کے بجائے ارواح و نفس کے مخفی اسرار کھولنا۔ نمائندگی کو فرشتہ کے بجائے تو واضح شد فرشتہ اور مساوات کے جذبات ابھارنا ہلک آلات سے مخلوق خدا کو بیدار نہ اندازے سے تباہ کرنے کے بجائے رحمت عامہ اور عالمی امن و سکون کے دروازے کھول دینا۔

اور عالمگیر اخلاق کاملہ سے دیانت و امانت، محبت و ہمدردی، ایثار و احسان کے جذبات پیدا کر دینا۔ معاصی کو رسمی انداز سے روکنے سے زیادہ دلوں میں معاصی سے نفرت بٹھلا دینا۔ اور نفس میں نفسِ شیطانی کی حکومت کے بجائے عقل و شرع کی حکومت قائم کر دینا وغیرہ واضح ہو گا۔ جو حقیقتاً خلافتِ الہی کا تقاضا کر رہا ہے اور ایوم املت لکم دینکم کا سچا مصداق ہے۔ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ دنیا کو سنوارنے کا طریقہ اچھی چیزیں بنانا نہیں بلکہ اچھے آدمی تیار کرنا ہے۔ خلافت کے معنی ایفیکٹریاں قائم کر کے بازاروں کو تجارتی سامانوں سے بھر دینا نہیں بلکہ دل و دماغ کی رنگ آلودی کو صاف کر کے ان پر پاکیزہ افکار، پاکیزہ عقائد اور پارسانی کے اعمال ڈھال کر نکالنا ہے جس سے انسانیت نشوونما پائے اور بہمیت اور زندگی کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے۔

اس فرق کے بعد عالم کے ہیرو۔ اور خلفاء الہی ملحدان یورپ یا ملحدان ماضی فرعون ہامان، نمرود اور شداد یا قیصر و کسری ثابت نہ ہوں گے۔ جنہوں نے مادی سائنس کے شاہکاروں سے دنیا کو معمور کیا۔ بلکہ اس اسوۂ محمدی کی روشنی میں صدیق و فاروق، علی و عثمان، خالد و ابو عبیدہ۔ اور اوپر چل کر حضرت موسیٰ و عیسیٰ، حضرت نوح و ابراہیم اور تمام انبیاء سابقین۔ اور تمام صالحائے عالم ثابت ہوں گے۔ جنہوں نے صفحہات کائنات کا گہرا مطالعہ کر کے

ان مادی شہکاروں کو مٹانے میں اپنی پوری قوت صرف فرمائی۔ روحانیتوں
کو اجاگر کیا اور مادیت کو سرنگوں بنایا اور مادی وسائل کی محتاجگی سے مخلوق کو
نکال کر روحانیت کی آزاد فضا میں پہنچایا تاکہ مادی زندگی کے سکون و
لذت سے بھی محروم نہ رہے اور روحانی زندگی تو ان ہی کا حقیقی حصہ تھی۔
یہاں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگوں میں وہی وسائل لانے
تھے جو دشمن کے کہ آتا تھا صوبہ نہ کوئی مغلی نظریہ ہے نہ تاریخی کبھی تشدد
کا مقابلہ عدم تشدد سے ہوتا ہے جیسے مکہ کی زندگی میں ہوا۔ اور آج بہت سی
اقوام نے اس اصول پر طاقتور دشمنوں سے نجات حاصل کر لی۔ اور کبھی
حرب و ضرب کا مقابلہ عبر اور مقاومت مجہول سے کیا۔ اور فتح پالی جس
سے واضح ہے کہ اسلحہ کے مقابلہ میں کبھی اخلاقی قوت اسلحہ سے بھی زیادہ
کام دیتی ہے۔ اس سے بھی اوپر کا مقام روحانی قوت ہے یعنی تعلق مع اللہ
اور رابطہ عبود و معبود جو ہر قوت سے بڑھ کر قوت ہے۔ اگر اسلحہ اور سامان
جنگ کی قلت کے ساتھ روحانیت قوت یقین توکل و صبر و استقامت
اور موت شہادت کی محبت کا جوش ہو۔ اور انسان اللہ کا سپاہی بن کر
میدان میں آجائے تو اس کے سامنے بڑے بڑے سانوں والی فوجیں نہیں
ٹھہر سکتیں۔ سلف کی جنگیں اسی عنوان کی تھیں۔ وہاں نہ اس کی پرواہ کی
جاتی تھی کہ پہلے فوج کی تعداد دشمن کے عدد کے برابر کہیں۔ نہ اس کی کہ سلمان

دشمن کے جیسے سامان کے برابر ہو جائے۔ نہ اس کی کہ پہلے مال و دولت کم از کم
 دشمن کے اموال کے مساوی ہو جائے تعداد کے بارہ میں تو ان کے سامنے
 ہدایت ربانی تھی کہ من قلیلة غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ
 مع الصابریین۔ اور ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین الخ
 جس میں تعداد کی قلت کا تدارک صبر و استقامت سے کیا گیا ہے نہ کہ
 تعداد برابر ہونے کے انتظار میں اصل مقصد سے روکا گیا ہے۔
 مصارف جنگ کی قلت و کثرت کے بارہ انہیں حضرت صاحب شریعت
 کا یہ فرمان پیش نظر رہتا تھا۔

انکم لن تسعوهم باموالکم تم دنیا کی اقسام پر اپنے مال و دولت (یعنی

ولکن تسعوهما بخلاقکم وسائل مادی) سے غلبہ نہیں پاسکتے بلکہ اپنے

اخلاق (یعنی وسائل روحانیہ) سے غالب آسکتے ہو۔

سامان رسد کے بارہ میں ان کے پیش نظریہ منظر تھا کہ حضور رسد و عالم غزوہ
 احزاب میں خندق کھود رہے ہیں اور قافلوں کی کثرت سے بدن کو سہارا دینے کے
 لئے پیٹ سے پتھر بندھے ہوئے ہیں جب کہ دشمنوں کے پاس سامان رسد کی
 کوئی کمی نہ تھی پس یہ نظریہ کہ حضور جنگوں میں ہی سامان اور ویسے ہی اسلحہ لے کر تشریف
 لاتے تھے جیسے دشمنوں کے ہوتے تھے نہ عقلی ہے نہ تاریخی۔ ہر قوم اپنے مزاج کے مطابق
 سامان کرتی ہے۔ مسلم قوم کا اصلی مزاج سامانوں پر توکل نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ۔

اور اپنی عبدیت کے پیش نظر یا نفس کو فی الجملہ تسلی دینے کے لئے کسی حد تک وسائل کا اختیار کر لینا ہے۔ یہی ان کی تاریخ ہے۔ اور یہی ان کا مزاج۔ دوسری اقوام کے مزاجوں کی رعایت میں غرق ہو جانے یا موعوبیت کے ساتھ اقوام کی نقالی کرنے یا آج کی متمدن اقوام کی مادی ترقی کو اسوہ اور نمونہ بنا کر اس کے معیار پر اپنے کو جانچنے سے یہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنے اصلی مزاج پر آجائیں۔ اور یہ جدید رجحانات۔ اور جدید تقاضوں کے پورا کرنے کے زبان زد عنوان کو ترک کر کے اپنے ہی اصلی رجحانات اور بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یہ ذہنی کشمکش ختم ہو جائے جس نے آج پریشانی میں ڈال رکھا ہے۔ مقصد سلف کا مذاق پیدا کرنا اور اسی مذاق پر ظاہری سامان اور مادی وسائل کا ہبیا کرنا ہے کہ اس کے بغیر صحیح نتائج پیدا ہونے کی صورت نہیں ہے۔ ان تصریحات کے بعد ہمارے نزدیک مادیات سے ملا کی جہالت مضر نہیں رہتی۔ البتہ مخالف ملا کی جہالت روحانیات اور اسلامی مذاق سے جہلک ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ملا تو روحانیات کا عارف بن کر مادیات کے نشیب و فراز سے بھی نا بلد نہیں رہتا۔ لیکن بے بصیرت مخالف ملا سائنس کی تمام معلومات پر کھروسہ اور ناز کر کے حقائق الہیہ سے یکسر غافل رہ جاتا ہے یعنی طاعت کی راہ سے ملا تو عارف اسرار ہو جاتا ہے اور استکبار کی راہ سے مخالف ملا اپنا فطری سر یا یہ کھو بیٹھتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ لکہ ملا سے میری مراد کھٹ ملا۔ اور بے بصیرت کھٹ حجت لوگ نہیں بلکہ وہ عارف و با بصیرت ملا ہے کہ جس کی نگاہوں میں حقائق الہیہ سمائی ہوئی ہوں۔ اور اس لئے برق و بخار گیس و

دندان وغیرہ جیسی حقائق مادیہ اُسے لہو و لعب نظر آتی ہوں۔

اس سے میرا مقصد مسلمان کے حق میں سائنس اور فلسفہ کے میدان کو تنگ کرنا یا قوت و شوکت کے مادی وسائل سے کلینتہ محروم بنانا نہیں بلکہ ان کی حدود پہلانا ہے کہ وہ وسائل محض ہیں مقاصد نہیں۔ وہ خود خلافت نہیں بلکہ تحفظ خلافت کے وسائل ہیں سے ادنیٰ درجہ کے وسائل ہیں۔ نیز یہ کہ وہ جو کچھ بھی ہوں قرآن کی آیات تکوین کا جن کو اس سلسلہ میں بطور ماخذ کے پیش کیا گیا ہے نہ مدلول ہیں نہ مصداق ہیں۔ اور نہ کوئی تقاضا کردہ عمل ہیں۔ ان کا ماخذ دوسری آیتیں ہیں جنہیں انکی نوعیت اور حدود پر کافی وافی روشنی ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا ہے کہ یہ مادی سامان مسلمان کے لئے میدان ترقی ہی نہیں کہ ان میں گھس جانا اس کی مدح و ذم یا ایمان داری وغیر ایمان داری یا لفظی و معنوی کفر و اسلام کا معیار قرار پا جائیں مسلمان کے لئے معیار مدح و ذم صرف علم و اخلاق و تصرف روحانی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ مادی تصرفات بقدر ضرورت رکھے گئے ہیں فی نفسہ مقصود و معیار نہیں۔

اسی سے حریت و آفاقی کا مفہوم بھی اسلامی حیثیت سے متعین ہو جاتا ہے کہ وہ تلوار ہاتھ میں لے لینا نہیں بلکہ قانون حق کو نافذ العمل بنانا ہے پہلے اپنے اوپر پھر ماحول اور اس کے پس و پیش پر۔ اگر کسی قوم نے تلوار ہاتھ میں لے کر قرآن کو اپنے ذرا اپنے ماحول پر نافذ کر لیا تو وہ بلاشبہ آقا ہے ورنہ قطعاً طور پر غلام ہے خواہ نفس کی ہو یا غیر کی۔ پیغمبر معصوم اور صحابہ کرام مکہ کی تیرہ سالہ

زندگی میں بھی آفات تھے جبکہ تلوار ہاتھ میں نہ تھی بلکہ اس کی اجازت بھی نہ تھی۔ اور
 مدینہ کی دس سالہ زندگی میں بھی ویسے ہی آفات تھے جبکہ وسائل شوکت ان کے
 ہاتھ میں تھے۔ کتنے ہی انبیاء علیہم السلام کو جہاد و سیاست سرے سے دیئے ہی
 نہیں گئے۔ بعض کو دیئے گئے۔ لیکن دونوں کی آفتابی اور امر اللہ کی تنفیذ میں خواہ
 وہ اخلاقی ہی رنگ میں ہو۔ اور عند اللہ مقبولیت و عظمت میں کسی کلام کی گنجائش
 نہیں جس سے واضح ہے کہ آفتابی کی حقیقت کوئی قدر مشترک ہے جو تلوار اور
 بے تلواری دونوں میں بدستور قائم رہتی ہے۔ اور وہ صرف دیانت انابت اور
 اشاعت ہے۔ اور جس کا حاصل اللہ کی غلامی ہے کہ اس میں آفتابی کا راز
 پنہاں ہے۔

یہی دونوں حالتیں امت پر بھی گذرنی تھیں۔ امت کے بعض طبقے مکہ کی
 زندگی میں آگئے جس کا حاصل محض پٹ لینا اور صبر کرنا نہیں بلکہ ماریں کھا کر اعلاء
 کلمۃ اللہ کرنا۔ اور ترویج کلام اللہ کو برابر انجام دیئے جانا ہے۔ جس کو قرآن نے
 جہاد کبیر فرمایا ہے۔ اور بعض مدینہ کی زندگی میں آگئے۔ جس کا حاصل قوت سے
 استیصال فتنہ کر کے اشاعت دین کی راہیں ہموار کرنا۔ اور شعائر اللہ کو ادا
 بنانا ہے تاکہ دین حق ہمہ گیر اور غالب ہو جائے جس کو جہاد صغیر کہا گیا ہے۔
 دونوں زندگیوں کا قدر مشترک وہی تدرین بدین اللہ۔ اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔
 کلام اللہ اور تربیت خلق اللہ نکلتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ اور جو حقیقتاً ایمان

کے کمال و نقصان ہدایت و ضلالت۔ فحور و تقویٰ اور خلافت و عدم خلافت کا معیار ہے جس کی رو سے مسلمانوں کو پرکھا جاسکتا ہے۔ پس اعدا و الرحمہ ما استطعتم جیسی آیات کرمیہ کے نام پر تیر و تفتنگ جمع کر لینا یا تکوین کی آیات سے بے محل استنباط کر کے صنعتی، تجارتی اور عسکری کاروبار پھیلا لینا فی نفسہ خواہ کتنا ہی ضروری ہو مگر خود حریت و آقا ئی نہیں۔ آقا ئی قرآن کو نافذ العمل بنا دیتا ہے۔ جس کے لئے یہ اعداد مستطاع ایک وسیلہ اور ذریعہ سے زیادہ نہیں چھپے وضوء قرآن کی رو سے فرض و واجب سہی مگر ہے بہر حال محض مفتاح صلوة بلکہ وہ ضروری بھی اسی کی وجہ سے ہے فی نفسہ نہیں ہے۔

پس اگر ایک قوم نے شوکت حاصل کر لی۔ لیکن اس کی شوکت دین کے حدود و شعائر قائم کرنے سے غافل یا عاجز رہی تو اسے حریت و آقا ئی کے دعوے یا تصور کا کوئی حق نہیں۔ وہ بدستور غلام ہے۔ دوسروں کی ہو یا اپنے نفس کی۔ اور بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ زیادہ سے زیادہ دوسرے غلاموں۔ اور اس میں یہ فرق ہوگا۔ کہ ایک بے تلوار کے غلام ہوں گے اور ایک باتلوار۔ لیکن نفس غلامی نفس یا غیر میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ بلکہ تلوار سمیت غلامی زیادہ تنگ و عار ثابت ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کے تلوار بدست منطوقوں کی بے حرمتی یا بے توقیری کے درپے ہیں۔ معاذ اللہ ہم ان کے ہر حالت میں دعا گو ہیں۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اگر ان کی یہ شوکت اعلاء کلمۃ اللہ سے ہمکنار

نہیں بلکہ اور اَلْمَا اَعْلٰی کلمۃ الکفر یا کلمۃ الفسق سے ہم آغوش ہے تو وہ ابھی تک
 نہ صرف وسائل بے مقصد ہی کے جاں میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ خلاف
 مقصد تک و تاز کرنے سے ان کی یہ شوکت بھی کوئی اسلامی شوکت نہیں۔ اگر
 ہے تو کسی حد تک محض قومی اور قوموں کے اشتراک کی وجہ سے خالص قومی
 بھی نہیں۔ بلکہ وطنی۔ اور وہ بھی اگر غیر کی دست نگر ہے تو وطنی بھی نہیں بلکہ
 ایک نمائشی شوکت ہے۔ پس اس قسم کے منطقے یا تحصیل مقصد آقائی کے تصور
 میں غلط رو اور دعوائے حریت میں غلط گو ہیں۔ جبکہ اسلام میں حریت و آقائی
 تلوار کا نام نہیں تنفیذ عدل قرآن کا نام ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ وسائل اس
 کے وسائل بھی نہیں۔ اور اس لئے ایسے منطقے نہ مقصود کے حامل ثابت ہوتے
 ہیں نہ وسائل کے۔ بلکہ ان کی نسبت تو شاید وہی لوگ کچھ غنیمت ثابت
 ہوں گے جو کم از کم اعلاء کلمۃ اللہ۔ ترویج کلام اللہ۔ اور تربیت خلق اللہ کے
 مقصد کو علماً و عملاً سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور باقی کے لئے جذبہ صادق سے
 قلوب کو خالی بھی نہیں پاتے۔ پس اگر نیک کی صابرانہ زندگی تبلیغی جہاد کی وجہ سے
 مجاہدانہ اور وہ بھی بجا کبیر زندگی کہلائی جاسکتی ہے تو ایسے افراد کی زندگی اس
 دور فتن میں کیوں اس پاک لقب کی مستحق نہیں ہو سکتی؟ اور جو لوگ تلوار بدست
 ہو کر بھی اپنی عملی زندگی سے ان حقیقی مقاصد کی تکمیل کا ثبوت نہیں دیتے تو یہ
 اسی کی دلیل ہوگی کہ ان کے مضمحل نظریات صرف دنیوی اقتدار اور جاہ و عیش تک

محدود تھے۔ گوان کا زبانی دعویٰ کچھ بھی تھا۔ نیز ثابت ہوگا کہ وہ با اقتدار تہذیب کو
 خلافت نہیں سمجھتے بلکہ صرف اقتدار ہی کو خلافت و ایمان سمجھے ہوئے ہیں۔ اور
 ظاہر ہے کہ ایسے اقتدار پر جس میں ملک اور دین تو ام نہ ہوں بلکہ ملک بلا دین
 ہو تو وہ یقیناً خلافت نہیں بلوگیت ہے اور جبکہ وہ بلوگیت بھی تحفظ دین و شعائر
 دین کا ذریعہ نہ بنے بلکہ اگر ذریعہ ہو تو منافی دین امور کے تحفظ کا ہو تو وہ بلوگیت عادلہ
 بھی نہیں بلکہ ملک عضو ضعیف ہے جسے کٹ کھنا ملک کہا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ شوکت افتاء گناہ کے بجائے اضافہ گناہ کا ذریعہ
 ثابت ہوگی۔ اور اس صورت میں اس گناہ و فاحشہ کی نسبت انہی کی طرف کی
 جائے گی۔ جنہوں نے اضافہ گناہ کے ان پر شوکت و مسائل کو تمام اسباب افتاء
 گناہ اختیار کر لیا ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے ملزوم کو مان لیا ہے تو لوازم کا ماننا
 لا محالہ ان کے ہی سر پر پڑے گا۔ خواہ ان کا یہ ارادہ دینیت بھی نہ ہو۔ رہی حکومت و
 سلطنت تو اسباب معاش، صنائع و حرفت اور اسلحہ جنگ کی طرح وہ بھی وسیلہ
 قیام دین ہے خود بذاتہ مقصود نہیں اور اگر خلافت مقصود کا ذریعہ ہو سخت مفہم
 ہے۔ سلطنت کو مقصود اصلی باور کرانے اور محکوم مسلمانوں کو جو بد قسمتی سے کہیں
 دوسری اقوام کے غلام بن گئے ہوں غیر صالح یا غیر مؤمن یا لفظی مؤمن اور عملی کافر
 باور کرانے کے لئے عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون زمین کے مالک میرے نیک بندے ہونگے

جس کا حاصل یہ نکالا گیا ہے کہ صالح افراد جو اپنی محنت و ایشیا، تسخیر کائنات، تنظیم، جدوجہد اور جفاکشی وغیرہ سے سلطنت کا استحقاق پیدا کر لیں زمین کے حکمران ہوں گے۔ لہذا جو حکمران ہیں وہ تو صالح ہیں خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں؛ اور جو نہیں ہیں وہ غیر صالح اور لفظاً مومن اور عملاً کافر ہیں۔

لیکن جبکہ یہ آیت اس بارہ میں خاص نہیں تو اس سے کہیں کے محکوم مسلمانوں کو ایمان کے بعد اسماء فسوق سے یاد کیا جانا انتہائی جسارت اور قرآن کی تخریب ہے۔ کیونکہ۔

(۱)۔ اول تو ان الارض کو ارض دنیا میں منحصر مان لینا ہی بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔ سلف میں بکثرت اس سے ارض جنت مراد لے رہے ہیں۔ اور اسی کو اوفق بالقدر ان کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ سیاق و سباق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں صلاح کو تحصیل سلطنت کی جدوجہد میں منحصر مان لینا غلط ہوگا۔ کیونکہ جنت میں امت مرحومہ اور ائم سابقہ کے وہ لا تعداد انسان بھی جائیں گے جنہیں سلطنت نہیں ملی بلکہ ان کی شریعت ہی میں سلطنت نہیں رکھی گئی اور انہیں جہاد و سیاست کا سرے سے مکلف ہی نہیں بنایا گیا۔ اندریں صورت اس آیت سے محکوم مسلمانوں کو غیر صالح ٹھہرانا محض ایک جذباتی بات ہوگی۔

(۱۲)۔ اور اگر ارض سے ارض دہیا ہی مراد ہو اور وراثت ارضی سے حکومت و سلطنت تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں ساری زمین کی مراد لینا بھی بے دلیل ہوگا۔ جبکہ پورے روئے زمین پر مسلمانوں کی حکومت نہ آج ہے نہ قرن اولیٰ سے آج تک ہوئی۔ ورنہ تیرہ صدی کے تمام مسلمان حتیٰ کہ قرن اولیٰ کے بھی۔ معاذ اللہ غیر صالح اور عملی کافر ٹھہریں گے۔ محکوم مسلمان بوجہ غلامی کے اور حکمران مسلمان بوجہ محذور السلطنت رہ جانے کے۔

(۱۳)۔ اور اگر وراثت ارض سے کل ارض کی نہیں بلکہ بعض ارض ہی کی حکومت مراد ہو تو جس صورت میں کہ یہ بعض غیر معین ہے اس حکومت کے تحقق کے لئے کیفیت ما تفق کسی خطہ زمین پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانا کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غیر آزاد خطوں کے محکوم مسلمان آیت بالا کی رو سے عملی کافر یا غیر صالح نہیں ٹھہرتے البتہ اگر روئے زمین کے کسی خطہ پر بھی مسلمانوں کی حکومت نہ ہو تو اس صورت میں معنی مذکور کی رو سے سب گنہگار ٹھہریں گے۔

(۱۴)۔ اگر وراثت ارضی سے بعض معین خطوں کی حکومت مراد لی جائے جیسا کہ ملک شام اور فلسطین۔ چنانچہ بعض مفسرین سلف نے الارض کے الف لام کو لام عہد کہہ کر اس سے فلسطین ہی مراد لیا ہے تو پھر یہ آیت ایک مخصوص حکومت کی پیشین گوئی ٹھہرتی ہے جو دور صحابہ میں صالحین کے

ہاتھوں پوری ہو گئی۔ اب اس آیت کی رو سے کسی کو یہ حق کب پہنچتا ہے
کہ وہ بعد کے مسلمانوں کو جو بد قسمتی سے کہیں محکوم بن گئے ہوں غیر صالح
یا عملی کافر قرار دے۔ اس صورت میں اسلامی حکومت کی ضرورت کا
ماخذ بھی یہ آیت نہ ہوگی۔ اگر ہوگی تو یہ آیت ہو سکے گی۔

ان الارض لله، یومر شہا زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس
من یشاء من عبادہ کا وارث اپنے بندوں میں سے

بنادے۔

مگر اس میں وراثت کے ساتھ صالح کی قید نہیں۔ اس کی رو سے صالح
اور غیر صالح دونوں حکمران بن سکتے ہیں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ محکوم
صالح بھی ہو سکتا ہے اور غیر صالح بھی۔ پھر محکوم کو غیر صالح اور عملی کافر کہہ دینا
کس طرح جائز ہوگا؟

(۵) لیکن اگر اس آیت کو بلا تخصیص ساری ہی زمین کی حکومت پر محمول کر لیا جائے
اور صرف وہی لوگ صالح کے لقب کے مستحق ہوں جو حکومت بنائیں،
تب بھی اس وقت یا کسی وقت کے بھی محکوم مسلمان یا محکوم اسلامی خطے،
غیر صالح یا عملی کافر قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ کیونکہ اس آیت میں اس
ہفت اقلیم کی سلطنت کے لئے مسلمانوں کو کوئی میعاد نہیں دی گئی ہے کہ
اس کے اندر اندر اگر وہ آل و رد نہ مالگیر، حکومت بنالیں گے تو وہ صالح

رہیں گے ورنہ غیر صلاح اور عملاً غیر مؤمن ٹھہرائیں گے۔ ورنہ سب سے پہلے
تو یہ عدم صلاح کا الزام معاذ اللہ قرن اولیٰ ہی کے سر پرٹے جائے گا۔ تا بقرون
مابعد چہ رسد؟

ہاں اگر صلاح کا مطلب یہ ہو کہ قوم میں عالمگیر حکومت قائم کر لینے کا جذبہ
اور ولولہ اور استطاعت کی حد تک سعی و عمل ہو تو پھر قرن اولیٰ ہی نہیں
سارے ہی قرون مابعد جو اس دور حکومت سے قبل قبل کے ہوں اس الزام
سے بری ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی حکومت جب بھی قائم ہوگی تو وہ درحقیقت
اول سے آخر تک کی پوری امت کے جذبات اور مساعی ممکنہ کا نتیجہ
ہوگی۔ اور اس کی تشکیل میں پوری ہی امت حصہ دار ہوگی۔ کیونکہ امت
کے ایک ایک فرد کا ذہن اور عقیدہ اس میں لڑا ہوا تھا اور ہر پہلے کی
ذہنیت پچھلے کے لئے بنیاد بنتی چلی آرہی تھی۔ جو نہی ابتدائی اور
درمیانی افکار و اعمال کا لگاتار سلسلہ صدیوں کے بعد اپنی انتہائی حد
پر آ پہنچا۔ اور اس مسلسل تبلیغ و عمل سے بالآخر دنیا کی تمام قومیں اس
ذہنیت پر آ گئیں۔ دو نہی آخری نتیجہ عالمگیر حکومت کی صورت میں نکل آیا۔
اس لئے حکومت کے ان درمیانی قرون و ادوار میں امت کے کسی
طبقہ کو بھی غیر صلاح یا غیر مؤمن قرار نہیں دیا جائے گا۔ جبکہ ہر طبقہ اس
حکومت بنانے میں اپنی اپنی بساط کی حد تک ذہنا و عملاً شریک رہا ورنہ

یہ آخری مطلوب نتیجہ اچانک برآمد کیسے ہو گیا۔ اگر انکار دسائی کی ابتدائی
اور درمیانی گڑبیاں اسے برآمدگی کی حد پر نہیں لائے تھیں؟
یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں حتیٰ کہ آج بھی کسی حکومت کی
تشکیل کو صرف زمانہ تشکیل ہی کے افراد کی طرف منسوب نہیں کر دیتے بلکہ
آغاز تحریک سے لے کر انعام تحریک تک کے تمام ہی افراد کی ساعی کا نتیجہ
قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے اسٹیجوں پر تمام گزرے ہوئے لیڈروں اور بانیان
تحریک کا نام زندہ رکھا جاتا ہے، پنڈالوں میں ان کے نام کے گیٹ
بنائے جاتے ہیں۔ ان کے فوٹو اور مجسمے سجائے جاتے ہیں اور تقریر و
تحریر میں عقیدت سے ان کے تذکرہ کو زندہ رکھا جاتا ہے بلکہ بعد کے لوگوں
کو دین کے ہاتھ پر تحریک کی کامیابی ظاہر ہوتی ہے ان پہلے ہی لوگوں کی
کاوشوں کا منظر مانا جاتا ہے۔ پس اگر اس آیت میں وراثت ارض سے
کل ارض مراد لے کر عالمگیر حکومت ہی مراد لی جائے جو یقیناً اب تک
قائم نہیں ہوئی تو حسب تصریحات مفسرین اس سے لامحالہ وہی عالمگیر
حکومت مراد ہو سکتی ہے جو ظہور مہدی بعد نزول عیسیٰ کے وقت اس
دنیا کے آخری دور میں وقت کے حیاہ اہل اللہ کے ہاتھوں تشکیل پائے
گی۔ جس کے تحت پوری دنیا کا دین اور مسلک ایک ہو جائے گا۔ اور
لیظہرہا علی الدین علیہا کا کھلا ظہور ہو جائے گا۔ مگر جبکہ یہ حکومت

پوری امت کے ارتقائی جذبات و افکار کا ایک ظہور ہوگا۔ اور اس میں قرن اولیٰ سے لے کر قرن آخر تک کے تمام مسلمان اپنے اپنے جذبات و افکار اور ممکنہ اعمال سے شریک تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس حکومت عامہ سے پہلے پہلے کا کوئی طبقہ اور کوئی بھی محکوم علاقہ اس آیت کی رو سے غیر صالح اور عملی کافر ہوگا۔ ورنہ اس آخری طبقہ کے علاوہ جس کے ہاتھ پر اس عالمگیر تشکیل کا ظہور ہوا۔ سارے ہی طبقات امت معاذ اللہ غیر صالح اور غیر مومن ٹھہر جائیں گے۔ جس کا تصور بھی ہمارے نزدیک افسوسناک اور غمناک ہے۔ یہاں تک کہ یہ آج کے مدعی بھی اپنی ہی زبان سے اپنی تکفیر سے نہ بچ سکیں گے۔

(۶)۔ پھر یہ کہ اگر آیت مذکورہ میں صالحین کا مفہوم استحقاق حکومت پیدا کرنے کی جدوجہد اور جانکاہی کے افعال میں گھس جانے ہی کا کہا جائے۔ اور اس کی رو سے وہی لوگ صالحین کا مصداق ہوں جو اس سعی کے حامل ہوں ورنہ وہ عملاً کافر اور لفظی مومن رہ جائیں تب بھی کلیتہً کوئی مسلمان طبقہ غیر صالح نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ اس تفسیر پر جہاں آیت نے تشکیلی حکومت کی جدوجہد کو صلاح کہا ہے وہاں اس جدوجہد کی کسی خاص نوعیت کی تخصیص اور تعین نہیں کی کہ وہ کیسی ہو؛ بلکہ مطلق چھوڑ دیا ہے جس کے اطلاق کے نیچے فوجی سعی بھی آتی ہے کہ تشارد سے انقلاب کر دیا

جائے، اقتصادی سعی بھی آتی ہے جیسے غاصب اقوام کا تجارتی بائیکاٹ
 کر کے اول اقتصادی اور پھر سیاسی آزادی حاصل کرنی جائے۔ صنعتی اور
 تمدنی سعی بھی آتی ہے جیسے شہری اور ملکی ضروریات کی خود کفالت کر کے
 غاصبوں کی اقتصادی گرفت سے نجات حاصل کر لی جائے۔ عدم تشدد
 اور مقاومت مجہول کی سعی بھی آتی ہے جس سے غاصب قوم کو معطل کر دیا جائے
 آئینی اور پارلیمنٹری سعی بھی آتی ہے جس کے تحت الیکشنوں کے ذریعہ حکومت
 بدل دی جائے وغیرہ وغیرہ۔ غرض صلاح کے معنی اگر تحصیل حکومت کی سعی
 ہی کے رکھ لئے جائیں تو ان میں سے وہ کونسی سعی ہے جو اس آیت کے
 عموم سے باہر رہ جائے گی؟ اور جب کہ ان میں سے کسی نہ کسی سعی کو حسب
 اقتضائے مقام مسلمان اختیار کئے ہوئے ہیں اور کرتے چلے آ رہے ہیں تو وہ
 کونسا استدلال ہے جس کی رو سے وہ غیر صالح یا عملی کافر کہے جاسکتے
 ہوں؟ کیونکہ یا تو وہ برسر اقتدار ہیں یا ہوتے جارہے ہیں یا ہونے کی سعی
 میں لگ رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی نوع بھی صالحین کے مفہوم سے
 باہر نہیں ہوتی۔ جبکہ صلاح کے معنی اس سعی خاص ہی کے لئے جاویں تو
 پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ غیر صالح اور عملی کافر کس خطہ کے مسلمان ہیں جن کو
 مطعون کرنے کے لئے اس آیت کو بے محل استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷)۔ لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو عرب زدگانِ تمدن و سیاست کے لئے

دین کے برخلاف اپنے سیاسی منصوبے پورے کرنے اور اس میں حائل شدہ طبقات کو غیر صالح کہہ کر راستہ سے ہٹا دینے کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ آیت میں وراثت یا حکومت ارضی کے حصول پر بحث نہیں بلکہ استحقاق پر گفتگو ہے۔ اور حاصل یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ کے نیک بندے ہی اس وراثت کے مستحق ہوتے رہیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فساق و فجار اپنی چالاکیوں سے انہیں برسر اقتدار نہ آنے دیں۔ اور ان کی مساعی کو اپنی عیارانہ مساعی سے ناکام بنا دیں۔

لیکن اس سے ان کے استحقاق میں فرق نہیں آسکتا جیسے ہی وراثت کے سلسلہ میں اگر اصل وارث کو غاصب لوگ محروم کر دیں جس کی وراثت پر قدر ان نے اسی طرح روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک کا استحقاقی حصہ بتلا دیا ہے تو یہ نہیں کہ یہ وارث وارث نہ رہے اور یہ متغلب اور غاصب وارث بن جاوے۔

پس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حکومت ارضی کے وارث اور مستحق حقیقتاً صلحاء و اتقیا ہیں۔ اگرچہ کسی وجہ سے اس وراثت تک انہیں نہ آنے دیا جائے۔ نیز جبکہ ہر خیر میں کوئی نہ کوئی انشاء ضرور مخفی ہوتی ہے تو یہ اس خیر کا کہ "حقیقی وارثان اتقیا نیک بندے ہیں" حاصل یہ نکلے گا کہ مقتدر کی باگ ڈور صلحاء و اتقیا کے ہاتھ میں رکھو تا کہ وہ صلاح و عدل کے

ساتھ حکومت چلائیں اور نیکی و تقویٰ کا دنیا میں دور دورہ ہو جائے۔ آیت کے
یہ ایسے عام معنی ہیں کہ اس میں وہ تمام معافی داخل رہتے ہیں جو ابھی بیان
کئے گئے ہیں۔ اور کسی بھی دور کے کسی مسلم طبقہ کو خواہ مخواہ غیر صالح یا عملی
کافر بنانے کا شوق بھی پورا نہیں ہو سکتا۔

رہا صاحبین کا اقتدار سے محروم رہ جانا یہ کوئی عجوبہ نہیں دنیا میں ایسے
اوقات بہت کم آئے ہیں کہ اقتدار کی کنجیاں حق پرستوں کے ہاتھ میں رہی ہوں۔
عموماً دنیا پرست ان کے مقابلہ میں ایسا کر کے ہر جائز و ناجائز طریق پر اقتدار
غصب کرتے آئے ہیں جس کی مثالیں اہم سابقہ سے لے کر امت مرحومہ کے
اکثر قرون و دور میں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس محروم الاقتداری
کے باوجود شریعت نے انہیں صاحبین ہی کہا ہے۔ غیر صالح یا غیر مومن نہیں بنایا۔
حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں۔

اذ اظہر المعاصی فی امتی

عظیم اللہ بعتاب من

عندہ

فقلت یا رسول اللہ اما

فیہم اناس صالحون۔

قال یصیبہم ما اصاب

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ان

میں نیک لوگ رہا لیکن انہیں موتے؟

فرمایا انہیں بھی وہ عذاب پہنچتا ہے

الناس ثم ليعبرون الى
 صفتهم من الله ورضوان
 (تفسیر ابن کثیر ص ۲۹۹)

جو عام لوگوں کو ہتھیاتا ہے۔ پھر آخرت
 میں مغفرت و رضا کی طرف جاتے ہیں
 یعنی اپنی نیت پر ان کا حشر ہوگا۔ مگر

یہاں عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔

اس عذاب عام کی تشخیص بھی بعض روایتوں میں فرمائی گئی ہے کہ وہ غلامی ہے

لیوم من علیکم شرارکم
 ثم یدعو خیارکم فلا
 یستجیب لکم

تم پر تمہارے میں سے بدترین لوگ
 حاکم بنا دیئے جاتے ہیں۔ پھر تم میں
 سے اچھے لوگ دعائیں بھی مانگتے ہیں تو

(ابن کثیر ص ۲۹۹)

وہ قبول نہیں کی جاتیں۔

لیکن اس کے باوجود صالحین کو صالحین اور خیار کو خیار فرمایا گیا ہے جس
 سے واضح ہو گیا کہ غلامی کے باوجود صالحین کے صلاح میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔
 لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ صالحین اپنی صلاح پر غرہ کر کے آزادی اور غلامی
 کا فرق اٹھاویں، یا غلامی پر قناعت کر کے بیٹھ رہیں۔ یا صلاح کی علو باطن پر
 قناعت کر کے علو ظاہر سے کنارہ کش ہو جائیں اور انتہا الاعلوان کے ساعی
 اور طالب نہ رہیں۔ نہیں بلکہ صرف یہ عرض ہے کہ طعنہ زنون کو ان صالحین کے محکوم
 ہو جانے کے باوجود بھی انہیں بخیر صالح یا غیر مؤمن کہنے کا کوئی حق نہیں۔ اور اگر یہ
 جسارت آیت وراثت ارض سے کی جا رہی ہے تو وہ بے محل ہے اور کسی جائز تفسیر

پر مبنی نہیں۔ کیونکہ یہ استدلال دعویٰ عام اور دلیل خاص کا مصداق ہے۔
 آیت کریمہ کے جبکہ اتنے محمل ہیں اور اس کے عموم میں اتنی وسعت ہے کہ نہ
 ارض سے ارض دنیا ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ ارض دنیا مراد لے کر وراثت سے
 حکومت عالیہ ہی مراد لینا ضروری ہے، نہ حکومت عالیہ سے کل زمین کی حکومت
 مراد لینا ہی ضروری ہے، نہ کل زمین کی حکومت مراد لے کر اسے کسی مقررہ وقت
 میں حاصل کر لیا جانا ہی ضروری ہے تو ایسے محتمل اور کثیر المعنی استدلال سے اتنا
 بڑا دعویٰ جس سے یک نخت کروڑوں اور وہ بھی ہر دور کے مسلمان غیر صالح اور
 محض لفظی مومن اور عملی کافر زاریا جائیں آفرس طرح ثابت ہو جائے گا اور کیسے جائز
 ہوگا۔ اور جبکہ آیت کا وہ جامع اور وسیع مفہوم لیا جائے جس کے نیچے یہ تمام معافی آ
 جائیں یعنی استحقاق وراثت عام اس سے کہ حصول ہو یا نہ ہو تو پھر یہ تکفیر مسلمان کا
 دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے بحالت محکومی صاحبین کا صلاح نازل تو
 کیا ہوتا یہ آیت اس صلاح کے ثبوت کی دلیل بن جاتی ہے۔

بہر حال صاحبین کا سماوی طور پر گرفتار محکومی ہو جانا مصیبت ضرور ہے لیکن
 مصیبت نہیں کہ وہ تو بیک جنبش قلم غیر صالح بنا دیئے جائیں اور غاصبان اقتدار
 فاسق معین ہوتے ہوئے بھی صالح رہیں۔

الحاصل ان عرض کردہ سطور سے ان نظریات کی اصلیت کھل جاتی ہے
 جنہیں ”دو قرآن“ کے انوکھے عنوان سے بطور ایجاد بندہ آیات تکوین کا رد لول

بتلا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کی رو سے مادی وسائل زندگی اور مادہ کی توڑ پھوڑ یا ترکیب و تحلیل سے کچھ اسباب عیش اور کچھ اسباب ہلاکت ایجاد کرتے رہنے اور بالفاظ دیگر ان سے تاجرانہ طریق پر منتفع ہوتے رہنے ہی کو مقصد حیات اور اسلام کی اصل ترقی بادر کرایا گیا ہے اور پھر ان پر قابو پالینے اور ان کے ذریعہ کچھ رسمی جاہ و اقتدار حاصل کر لینے ہی کا نام خلافت اور ایمانداری بتلایا گیا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ

(۱) آیات نکوین کی رو سے صحیفہ کائنات کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن معرفت صانع کیلئے نہ کہ محض معرفت مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے لیکن قانون فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلاء کلمۃ الفسق قائم رکھنے کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے لیکن مادی حوائج سے غمگین بن کر کامل بننے اور بتانے کے لئے نہ کہ وفور اسباب سے اپنی محتاجگی بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کیلئے

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدر ضرورت ضروری ہیں لیکن تعاون باہمی برپا کرنے کے لئے نہ کہ مادیت میں غلو اور فنا فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیر کائنات ضروری ہے لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تحریف کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاع) ضروری ہے لیکن دشمن کی تقالی یا اس کے جیسے اعدا اور عدد ضروری ہونے کے ساتھ نہیں بلکہ فی الجملہ اس کی رعایت رکھ کر قوت قلب، حوصلہ یقین، اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام امور تمدن، سیاست، امارت، تسخیر، تکوین وغیرہ ضروری ہیں۔ مگر رضاء الہی اور قرب حق کے لئے نہ کہ رضاء نفس اور ارضاء غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے کہ جبکہ ان تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے تو بطور تفنن طبع اگر تعدد قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو تین قرآن کے عنوان کے ساتھ تاکہ کتاب اللہ عملی قرآن ہو۔ کائنات اللہ ربہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ کی ذات اقدس میں عملی قرآن ہو۔ نہ کہ دو قرآن کے نظریہ کے ساتھ جس میں سے تمثیلی قرآن دوسرے سے جدا ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے تو تبلیہ کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر یعنی بجائے ذات نبوی کے کائنات آجائے جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبر وار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت و شوکت یا حسب ضرورت دنیا کے ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں بلکہ انہیں آیات تکوین کا بدلہ لول کہے جانے، ان کے معیار کفر و اسلام ہونے اور

انہیں مقصدِ حیات کہہ کر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غلو و افراط اور مبالغوں سے ان میں منہمک اور فنا ہو جانے پر تکبر و انکار کرنا ہے۔ کیونکہ ان امور کی مقصودیت کا حاصل ماوریت خالصتہ ہے اور مادیت کا طبعی ثمر افراطِ عیش و اس مفرط عیش کا حاصل طغیان و سرکشی ہے جو نتیجہ حق سے بغاوت ہے اور تیاریِ آخرت اور اعلاء کلمۃ اللہ میں حارج ہے جس کا دوسرا نام فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خلافت نہیں بلکہ خلافت کی ضد ہے اور کون نہیں جانتا کہ اس ضد خلافت کو خلافت کہنا بلاشبہ تلبیس حق بالباطل اور کتمان حق ہے۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَابْتِغُوا الْعَمُونَ۔

ان حقائق کے اصولی طور پر واضح ہو جانے کے بعد ضرورت نہیں رہتی کہ وہ قرآن کے ہر ہر جزیئہ کے بارے میں علیحدہ علیحدہ کچھ کہا جائے جبکہ اصل نظریہ کے بارے میں اصولی تنقید اور تحقیق سامنے آگئی جو ان جزئیات کی روح اور قدر مشترک ہے جس سے تمام جزئیات کا خودی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع بھی جزئیات میں کلام کرنا نہ تھا بلکہ نظریات کی حد تک اصولی معروضات پیش کرنا تھا۔ جو ضرورت کی حد تک پیش کر دی گئیں۔ فَاِنْ يَكُ صَوَابًا فَمِنْ اِنْتِهَا وَ اِنْ يَكُ خَطَاً فَمِنْ وَاوَسْتِ الشَّيْطَانِ وَ لَاحْوَلُ وَ لَاقُوۡةَ اِلَّا بِاِنْتِهَا الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَ بِاِنْتِهَا التَّوْفِيْقِ۔

خَاتَمٌ

نظریہ قرآن پر ایک نظر

ایک نظر

مصنف

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

ناشر

پیشوا اللہ خاں پریس و ڈسٹریبیوٹرز